بی۔ایس۔جین جوہر

فن اور شخصیت

مرتّب : ڈاکٹر خالد حسین خاں

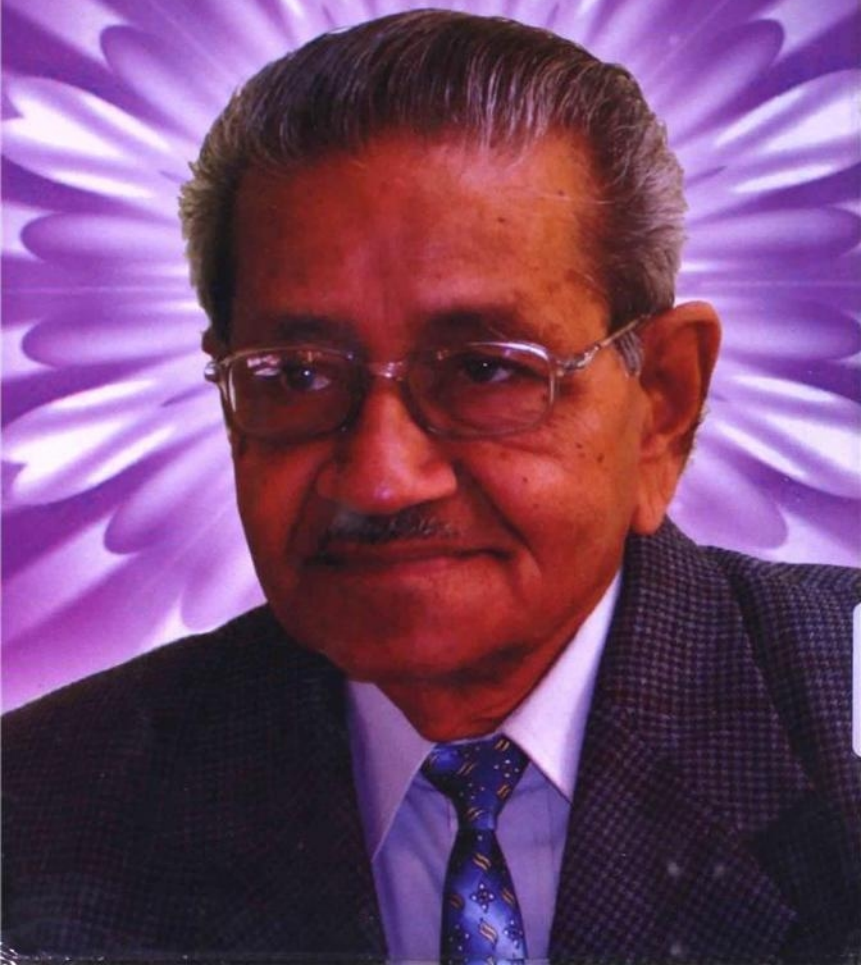

شری بی ایس جین جوہر کا مختصر تعارف

خاندانی نام : بکرم سین

پیدائش : مئی 1927، امین نگر سرائے (میرٹھ)

تعلیم : بی اے، میرٹھ کالج، میرٹھ سے (1947)

تلمیذ : علامہ سیماب اکبرآبادی

پیشہ : تجارت، ایک چھوٹا کارخانہ

شادی : شریمتی سُپلا جین (1948)

اولاد : نُپُن کمار جین

صلاحیت : اردو، انگریزی اور ہندی زبان پر عبور حاصل ہے۔

موجودہ پتہ : B-7، انڈسٹریل اسٹیٹ، پرتاپور، میرٹھ 250103

موبائل :09358400900

217/PMP/05

मोनिका धामी
प्रधान मंत्री की अपर निजी सचिव

प्रधान मंत्री कार्यालय
नई दिल्ली - 110 011
PRIME MINISTER'S OFFICE
New Delhi - 110 011

25 अगस्त, 2005
26

प्रिय श्री जौहर,

प्रधान मंत्री जी को सम्बोधित आपका पत्र प्राप्त हुआ जिसके साथ आपने अपने गज़ल/काव्य संग्रह 'तरान-ए-बेदारी' की एक प्रति भेजी है, धन्यवाद।

प्रधान मंत्री जी काव्य के क्षेत्र में आपके उज्ज्वल भविष्य के लिए अपनी शुभकामनाएं भेजते हैं।

मंगलकामनाओं सहित,

भवदीया,
मोनिका धामी
(मोनिका धामी)

श्री बी.एस. जैन जौहर
बी-7, इण्डस्ट्रियल एस्टेट
पर्तापुर, दिल्ली रोड
मेरठ-250103 (उ.प्र.)

غریباں'' کی جانب خوبصورت اشعار پیش کر کے ہمیں باور کرادیا ہے کہ وہ اردو شاعری کے مزاج داں ہی نہیں بھارت ورش کی گنگا جمنی تہذیب اور یہاں کی قدروں کے امین اور دلدادہ بھی ہیں۔ انکا مطالعہ شاعری ہماری تاریخ پر ہی نہیں یہاں کی تہذیب، اقدار اور روایات سے بھی ہے۔

اس نظم کے دوسرے بند میں انہوں نے ہولناک جنگ کی جانب بھی اپنے خیالات، احساسات اور اپنی دلی کیفیات کو خوب سیرت طور پر اجاگر کیا ہے۔ ان کا شعور اور وفور دونوں محاسن بھی اس بند کے ہر شعر سے عیاں ہیں۔ ہندی کویتا کے باوصف، ہمارے اردو شاعروں نے بھی اپنی نظموں کے حوالے سے بھارت کے برکھارُت کے کیف آگیں جذبات، خیالات، احساسات اور امنگوں و ترنگوں کو لفظوں کے پیراہن میں ملبوس کیا ہے۔ اس ذیل میں جوہر صاحب کا امتیاز و اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے بھارت کی ابلا ناری کے دلی جذبات، ساون کی کالی گھٹاؤں، ٹھنڈی ہواؤں اور مدہوش فضاؤں کی مرقع کشی کس خوبصورتی، دل آسائی اور سادگی سے اپنی ایک اور نظم ''برہ کا گیت'' میں کی ہے۔ بطور نمونہ ایک بند پیش ہے.....

شور مچا ہے ساون آیا
گلزاروں پر جوبن آیا
چھم چھم پانی برس رہا ہے
ملنے کو جی ترس رہا ہے
بجلی سے معمور گھٹائیں
تاریک و پُر نور گھٹائیں
برکھا رُت کی رین اندھیری
کانپ رہی ہے چھاتی میری
جس سے جوانی پھوٹی جائے
ساون آیا تم نہ آئے

جوہر صاحب نے یہاں ساون کی مناسبت سے مدھر، کومل اور سندر شبدوں کا استعمال بڑی فنکاری سے کیا ہے۔ مدھ ماتی ابلا ناری کے جزبات و جوبن کا اظہار اس سے بہتر ممکن بھی نہیں۔

جوہر صاحب کی مختلف نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نظم نگاری کے فن، اس کے مزاج اور اس کے متعلقات کے رمز آشنا نہیں، خواص بھی ہیں تاہم وہ غزل کے بھی والہ وشیدا ہیں۔ اپنے عہد اور روزمرہ کے حوادث وافکار سے بھی بخوبی آشنا ہیں۔ ان کے یہاں روایت کی پاسداری بھی ہے اور عصری آگہی بھی، مانوس موضوعات، من بھاون بحریں اور زمینیں بھی ہیں۔

ان کی غزلوں میں یہ تمام محاسن پوری طرح موجود ہیں۔ حصہ غزل کی پہلی غزل کے چند اشعار میرے خیال کو واضح کرنے میں یقیناً مُمد ہوں گے.....

ترا حسن کافرانہ، مرا عشق والہانہ
نہ تجھے خبر تھی اپنی، نہ مرا کوئی ٹھکانہ
مجھے دیکھ کر کسی کا سرِ راہ مسکرانا
یہی بات تھی ذرا سی یوں ہی بن گئی فسانہ
ترے حسنِ جاں فزا کی یہ ادائے کافرانہ
وہ نگاہیں نیچی نیچی، وہ فراز زیر شانہ

اردو شاعری میں داغ دہلوی کا طرزِ شاعری، عرصہ تک، غزل گو شاعروں کا محبوب وطیرہ رہا ہے۔ اس کی جھلک ورمق، جوہر صاحب کے یہاں بھی مل جاتی ہے مثلاً ان کا یہ شعر دیکھئے :

میری ہر بات پہ بے بات خفا ہوتے ہو
جانے کیا بات ہے دن رات خفا ہوتے ہو

محبوب کی بے وفائی، وعدہ خلافی، اس کے جور وستم کا ذکر اردو غزل کی تاریخ میں وافر تعداد میں ہے۔ روایتی مضامین کی بہتات نے گرچہ اس کو پامال بھی کیا ہے لیکن جوہر صاحب نے اس فرسودگی خیال کو کس خوبصورتی بیان سے مقامِ رفیع عطا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو.....

عہدِ وفا کسی سے، محبت کسی کے ساتھ
کیوں کھیلتے ہیں آپ مری زندگی کے ساتھ
کچھ التفات بھی ہو ملا دلکشی کے ساتھ
دل چاہئے تو لیجئے، دیں گے خوشی کے ساتھ

غزل کی لفظیات اور اسالیب، شاعر کے مزاج، ماحول، مذاق اور اس کے ذخیرۂ الفاظ کے وسیلے سے متعین ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ غزل کا لہجہ، شاعر کے مزاج و مذاق کا عطیہ کہا جاسکتا ہے۔ غزل کی سحر کاری اور اثر پذیری شاعر کی اپنی حسیّت و عصریت، شعور و جدان پر منحصر ہے۔ احساس و ادراک کی انفرادیت اور شعور و شعار کی اجتہادیت ہی اعلیٰ و ادنیٰ یا خوب ناخوب معیار و میزان کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔ نظمیہ شاعری عموماً، غزلیہ شاعری خصوصاً، ان دنوں دھڑلے سے لکھی جارہی ہے لیکن موضوعات کی مماثلت اور اسلوب کی یکسانیت، غزلیہ مجموعوں کے انبار کو لے ڈوبتی ہے۔ وہی آدم و حوا کے جنسی یا ارضی پہلو کی مرقع کشی اور بے حجابی کی بہتات، اس کے برخلاف جمال و جلال، فطرت (Nature) سے وابستہ دوسرے مضامین و موضوعات، بالعموم ہمارے غزل گو شعراء کے لئے اجنبی، غیر اہم یا پھر بے معنی ہوتے ہیں۔ وہ صرف ردیف و قافیہ کے التزام اور فنِ عروض کے اہتمام کے پیشِ نظر مظاہرِ فطرت اور مناظرِ قدرت کا بنظرِ غائر مشاہدہ و مطالعہ کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اسی سبب ان کی غزلیہ شاعری میں وزن، وقار اور معیار و افکار کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس سیاق میں جوہر صاحب کی شاعری، معیاری نہ سہی متوازن اور موجب ستائش ضرور ہے۔

بی ایس جین جوہر کی شاعری میں مذکورہ خصوصیات موجود ہیں اور جس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ دبستانِ میرٹھ کے سخنوروں میں جوہر صاحب بحیثیت شاعر اپنی شناخت و شہرت قائم کرنے میں نہ صرف کامیاب بلکہ سرخ رو بھی ہوں گے۔ مجھے امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ ان کا یہ اولین مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' اردو اور ہندی کے شیدائیوں میں یکساں مقبول ہوگا اور جوہر صاحب کے شاعرانہ جوہر ان کو تاریخِ ادب میں سندِ اعتبار اور مقامِ افتخار بھی عطا کریں گے۔

OO

Prof. Khalid Husain Khan
27/10, Shastri Nagar, Behind Iqra Public School,
Meerut-250003
Mobile : 09358285859

نذرِ جوہرؔ

محفل شعر و سخن کی شان ہیں جوہرؔ
روح نظموں کی غزل کی جان ہیں جوہرؔ
اک نرالی سوچ جس کا اک الگ انداز ہے
شاعری کی منفرد پہچان ہیں جوہرؔ
غور سے ان کو ذرا پڑھئے گا آپ
ذہن و دل کے واسطے عرفان ہیں جوہرؔ
جس پہ نازاں ہیں محبت اور خلوص
آدمی کے درمیاں انسان ہیں جوہرؔ
شاعری میں اور گل بوٹے بھی ہیں
اس چمن میں اک گلِ ریحان ہیں جوہرؔ
ہیں ادب کی نعمتوں سے مالا مال
کیسے کہہ دوں بے سرو سامان ہیں جوہرؔ
شان میں ان کی کہے غازیؔ بھی کیا
چار سُو جاری ہے وہ فیضان ہیں جوہرؔ

○○

Dr. Mohd. Yunus Ghazi
716, Zaidi Nagar Society, Opp. Gurudwara,
Meerut-250003
Mobile : 09358435432

○ ڈاکٹر محمد اسلم

جوہر کی شاعری ''ترانۂ بیداری'' کی روشنی میں

''جوہر'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے متعدد معنی ہیں۔ ان میں سے یہاں دو پر غور کرنا مناسب ہے یعنی پہلا عطریت اور دوسرا معنی وہ چیز جو بذاتِ خود قائم ہو۔ اب سوال اٹھتا ہے کہ کسی شاعر کے کلام پر گفتگو کے دوران اس کے تخلص سے بحث کرنا چہ معنی دارد؟ سادہ سا جواب یہ ہے کہ نام ہو یا تخلص، ان دونوں کا نام والے کی ذات پر اثر پڑنا ناگزیر ہے۔ یہی حال شعری مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' کے خالق جناب بکرم سین جین جوہر صاحب کا ہے۔ بکرم یا وکرم سنسکرت کا لفظ ہے۔ اس کے معنی بل، شکتی، طاقت پرشارتھ و بہادری کے ہیں۔ سین سنسکرت لفظ شیئن کا عوامی روپ ہے جس کے معنی باز یا شاہین کے ہیں۔ جوہر کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نام و تخلص کی خصوصیات ان کی شاعری میں کئی طرح سے منعکس ہوئی ہیں جس کی تفصیل مضمون کے آخر میں درج ہے۔ اردو ادب میں ایک جین، پروفیسر گیان چند جین، نثر کے مردِ میدان بن کر، اردو کی نثری داستانوں و مثنویوں کا کھنگالتے رہے اور آخر کار جب تھک گئے تو اپنی دھرتی سے کٹ کر امریکہ جا بسے۔ لیکن ہمیں فخر ہے کہ دوسرے جین یعنی بکرم سین جین جوہر اپنے وطن کے ہر ذرّہ سے پیار کرتے ہیں اور اپنے دیش کی اقتصادیات کو مضبوط بناتے ہوئے اردو شاعری کے چمن کی آبیاری کرنے میں منہمک ہیں۔

شاعرِ خوش فکر جناب جوہر صاحب قصبہ امین نگر سرائے، میرٹھ کے ایک علمی و خوش حال گھرانے میں تولّد ہوئے۔ دراصل میرٹھ وہی علاقہ ہے جو اپنی حق گوئی و بیباکی کے لئے بڑا مشہور

ہے۔ اس علاقے کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے ظالم و جابر انگریزوں کی غلامی کے خلاف، علم بغاوت بلند کر کے، آزادئ ملک کی خاطر مشترکہ پیمانہ پر، پہلی بڑی لڑائی میں ہراوّل دستے کا کام کیا۔ یوں تو اس سے پہلے غیر منظم طریقے سے ہزاروں عالموں نے مادرِ وطن کی آزادی کے لئے اپنی جانیں قربان کیں لیکن افسوس کہ آج ہم ان کا نام لینا بھی گوارہ نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں اس علاقے نے شروع ہی سے زبان و ادب اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اسمٰعیل میرٹھی جیسے شاعر سے کون واقف نہیں؟ یہاں یہ کہنا مناسب ہے کہ عصرِ حاضر میں شگفتہ طرزِ نگارش کے مالک، بلند پایۂ محقق، نقاد و ادیب، درس و تدریس اور تحقیقی کاموں میں منہمک ایک شفیق استادِ محترم پروفیسر خالد حسین خاں صاحب، جن سے میں مستفیض ہوا ہوں، دوسرے میرے ہمنام یعنی ڈاکٹر اسلم جمشید پوری صاحب، بھی اسی علاقے سے وابستہ ہیں، راقم کو بھی اسی علاقے کی نسبت پر فخر حاصل ہے یعنی دانش گاہ میرٹھ سے وابستہ رہ کر ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہینؔ جیسے فعال رہے اہلِ قلم، ماہر لسانیات، قابل نقاد، معتبر محقق اور زبانِ اردو کے شیدا سے مستفید ہوا۔ غرض کہ اس علاقے میں پہلے اور آج بھی نامور شعراء و ادیب اردو کی خدمت میں منہمک رہے ہیں۔ ایسے ہی اردو کے جانباز سپوتوں میں ایک نام بکرم سین جین جوہرؔ، کا بھی ہے۔

دورانِ ابتدائے تعلیم بعمر بارہ سال، جوہرؔ نے شعر کہنے کی ابتداء کی۔ یہ شوق ورثے میں ملا کیوں کہ والد کو بھی شعر و شاعری کا قدرے شوق تھا۔ دو برس بعد جین کالج بڑوت میں داخل ہونے کے بعد اس شوق میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں کالج کے اردو فارسی اساتذہ نے جوہرؔ کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ افسوس ہے کہ جوہرؔ صاحب نے اپنے مضمون ''کچھ اپنے بارے میں'' ایسے قابل اساتذہ اور شوقِ شاعری کو مہمیز کرنے والوں کا نام ظاہر نہیں کیا۔ جین کالج میں جوہرؔ کو مطالعہ کا کافی شوق پیدا ہوا۔ مطالعہ و مشقِ سخن سے ان کی شاعری میں نکھار آنا شروع ہوا۔ اسی زمانے میں ''تیج'' دہلی میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ انہوں نے علامہ سیمابؔ اکبر آبادی کی شاگردی بھی اختیار کی۔ جب والد کو جوہرؔ کی شاعری کا علم ہوا تو انہوں نے منع کیا، پھر بھی جوہرؔ کچھ

نہ کچھ کہتے رہے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے ایک دوسرے کالج کے مشاعرے میں ''ایامِ طفلی'' نظم سنا کر سماں باندھ دیا۔ میرٹھ کالج کی تعلیم کے زمانے میں بھی شعر و شاعری کا شوق رہا لیکن اب وہ اس جانب زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سا موزوں کلام ضائع ہوتا رہا۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ محفوظ کرتے رہے اور آخر کار مجموعۂ کلام بعنوان ''ترانۂ بیداری'' ۲۰۰۵ء میں شائع کرایا۔ اسی کی روشنی میں جوہر کی شاعرانہ خصوصیات کا سرسری جائزہ پیش ہے لیکن اس سے قبل ایک نظر شعری مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' پر.....

نہایت جاذب نظر یہ شعری مجموعہ یوں تو دو سو بہتر صفحات پر مشتمل ہے لیکن جوہر نے جدّت پسندی اور عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مجموعے کو اردو کے ایک سو چھتیس صفحات کے ساتھ دیوناگری رسم الخط میں ''اسی مضمون کے'' اتنے ہی صفحات شامل کر کے نورنگ کتاب گھر دہلی سے شائع کرایا جو چار رنگوں یعنی نیلا، پیلا، کیسریا اور سفید پر مزیّن ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سرِ ورق پر ایک درخت کی تصویر کے اردگرد ''نروان'' جیسا دائرہ بنایا گیا ہے جو شاعر کے ذہن و فکر اور مسلک کا عکاس ہے۔ دوسری جانب شاعر کی سنجیدہ، باوقار اور مؤثر تصویر اور ایک غزل ''جانے پھر تم سے ملاقات کبھی ہو کہ نہ ہو.....'' لبخط شاعر چھاپی گئی ہے۔ کتاب پر خوبصورت فلیپ بھی اسی طرح کا ہے جس پر شاعر کے مختصر سوانحی کوائف اور پتہ درج ہے۔

مضبوط جلد والے اس مجموعے کا کاغذ دبیز، چکنا اور سفید ہے۔ کمپوزنگ و طباعت میں اغلاط نہیں ہیں۔ صفحہ آٹھ تا گیارہ فہرست مندرجات ہے۔ اردو کے بے باک نقاد اور شاعر خوش نوا جناب رفعت سروش صاحب کا تحریر کردہ تنقیدی مضمون بعنوان ''بی ایس جین جوہر کی شاعری'' صفحہ بارہ تا چالیس شاملِ اشاعت ہے۔ بعدہ، جوہر صاحب نے خود اپنے حالات اور تخلیقی سفر کی مختصر روداد صفحہ بیالیس تا اڑتالیس درج کی ہے۔ مجموعے میں صفحہ پچاس سے ایک سو چوالیس کل انیس نظمیں صفحہ ایک سو چھیالیس تا دو سو چونتیس، اکتیس غزلیں صفحہ دو سو چھتیس سے دو سو باسٹھ سینتیس قطعات اور آخر میں دو سو چونسٹھ تا صفحہ دو سو ستر، بارہ دوہرے (دوہے) شاملِ اشاعت ہیں۔ اس

طرح یہ مجموعہ کلام نظموں، غزلوں، قطعات و دوہوں پر مشتمل جوہر کا دیوان رنگا رنگ نہ صرف شاعری کے دیوانوں بلکہ زبانِ اردو کے مستانوں کی ذہنی بیداری کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

مجموعے میں شامل نظموں کے آخر میں تاریخ بھی درج کردی گئی ہے۔ پہلی نظم کا عنوان ''ترانۂ بیداری'' ہے۔ اس میں جوہر نے انگریزوں کی غلامی سے عام ہندوستانی کو نجات دلانے کے لئے بیدار کرتے ہوئے لوگوں کو سرمایہ داروں کے چنگل سے نکلنے اور زندگی کے دوسرے میدانوں میں ترقی کرنے کی تلقین، بعض اساطیری وثقافتی حوالوں کی مدد سے کی ہے۔

آؤ اے ارجن کی اولادو! قصرِ وطن کی اے بنیادو!
طوفانوں سے لڑنا سیکھو دولت کی تعمیر گرادو
تم پر ہیں دنیا کی نگاہیں

یوں تو جوہر نے غزلوں، قطعات اور دوہے بھی کہے لیکن وہ بنیادی طور پر نظم نگار ہیں۔ نظموں میں ان کے جوہر سامنے آتے ہیں۔ ان میں بعض ہیئتی تجربے بھی کئے ہیں۔ وہ سماجی ذہن کی ناہمواریوں، لوگوں کی مکاریوں، سیاست میں خودغرضی، ظلم وستم، خود پرستی، ہوس رانی اور وبائے فیشن پر طنزیہ نظر ڈالتے ہیں۔ اپنی دھرتی سے اٹھنے والے صدا یعنی پیغامِ اہنسا کو اپنی فنکاری سے ایثار کا نغمہ ثابت کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی نظم ''مذہب'' کے چند مصرعے جستہ جستہ پیش ہیں جن میں عصری میلانات کی ترجمانی بھی نظر آتی ہے۔

لیڈر کی پجاری ہے دنیا، مذہب کے زمانے بیت گئے
غازے کی چمک، زلفوں کی مہک، پاؤڈر کی دمک، زیور کی کھنک
یہ ووٹ کی خاطر لڑتے ہیں، مذہب سے انہیں کچھ کام نہیں
پیغامِ اہنسا کا آخر دنیا کو سنایا گاندھی نے
مشرق کی سنہری وادی سے ایثار کا اک نغمہ پھوٹا

نظموں میں عشقیہ موضوعات کو پیش کرنے کی روایت، اردو شاعری میں خاصی جاندار

رہی ہے۔ جوشؔ، اخترؔ اور فیضؔ نے اس طرح کی جو نظمیں کہیں، ان میں بڑی دلآویزی اور رومانیت ہے لیکن جوہرؔ نے ایسی نظموں میں رومانیت کے پہلو بہ پہلو انسانی زندگی کی سچائیوں کی تھرتھراتی تصویریں بھی منعکس کی ہیں۔ ''محبت کس طرح کرلوں'' نظم سے یہ مصرعے ملاحظہ ہوں.....

لرزتے ہیں نگاہوں میں پرخچے زندگانی کے بتاؤ تو سہی تم سے محبت کس طرح کرلوں

رومانیت وحقیقت کی عکاسی کے ساتھ جوہرؔ کی شاعری کا ایک پہلو قدرت کی تصویر کشی ہے۔ ایسی نظموں میں ''اوشا''، ''وفا کی دیوی'' اور ''فطرت کا پجاری'' نہایت کامیاب ومؤثر نظمیں ہیں جن میں نیچر (Nature) کے مختلف نظارے بآسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان سے جہاں ہمارے ذوقِ جمال کی تسکین ہوتی ہے وہاں ہندوستانی تہذیب وثقافت کے بعض پہلو بھی ذہن نشین ہوتے ہیں.....

چمن میں رنگیں قبا پہن کر سحر کی دیوی ہے جلوہ گستر
وہ پیچ وخم کھاتی آرہی ہے پہاڑیوں سے حسین جمنا

جوہرؔ کی مذکورہ نظم ''اوشا''، ہمیں جوشؔ کی نظم ''الیلی صبح'' کی یاد دلاتی ہے لیکن جوہرؔ کی یہ خوبی ہے کہ انہوں نے ''اوشا'' میں مناظرِ قدرت کی عکاسی ہندوستانی کلچر کے بعض حوالوں کی مدد سے کی ہے۔ نظم ''وفا کی دیوی'' میں ایسے حوالے اور بھی واضح انداز میں آئے ہیں.....

یہ تصویرِ وفا ہے اپنے سوامی کی پجارن ہے
محبت کی یہ دیوی ہے، محبت کی بھکارن ہے
تجا ہے کامناؤں کو مرادوں کو لٹایا ہے
محبت کی بلی ویدی پہ اس نے دل چڑھایا ہے

نظم ''فطرت کا پجاری'' میں جوہرؔ نے شاعر کے پردے میں خود کو اور دوسرے انسانوں کو فطرت کا شیدائی بتاتے ہوئے کہا ہے کہ محض فطرت وحسن کا دیوانہ بننے میں انسان کی عظمت

ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ اس رواداری کو قائم کرنے کی سعی کرنا ہی انسان کا فریضۂ خاص ہے.....

لیکن تو نے یہ بھی سوچا، اے شیدائے فطرت
حسن کا دیوانہ ہونا ہے کیا انسان کی عظمت
کھیل رہی ہے خاک و خون سے پھر نسلِ انسانی
اپنے فرض سے غافل ہونا ہے تیری نادانی
ایسا کچھ لکھ جس سے بدلے کہنہ نظمِ عالم
اور رواداری پر آخر ہو یہ دنیا قائم
اے شاعر، اے حسن کے شیدا، اے فطرت کے پجاری

''درسِ آدمیت'' میں جنگ کی تباہ کاری و ہولناکی بیان کی اور اس سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے جوہر نے عام انسان کو اس کے اصل نشیمن کی یاد دہانی نہایت فنکاری سے یوں کرائی ہے.....

خونِ انسان کی ہولی کا تماشا ہے یہ جنگ
ڈھیر کر دیتی ہے اک آن میں ارمانوں کا
اے پرندے کبھی پرواز کی طاقت پہ نہ پھول
سیر کر خوب مگر اپنے نشیمن کو نہ بھول

نظم ''الوداع اے وطن'' میں جوہر نے اپنے وطن کے مناظرِ قدرت کی دلکش عکاسی کی اور اپنے پیارے و خوبصورت ملک کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد نہ کر پانے کی حسرت کا تخیلاتی اظہار کیا ہے.....

یہ حسین پہنائیِ عالم، یہ جنگل کا سماں
اودے اودے آسماں پر دودھ کی نہریں رواں
ذرّے ذرّے میں جمالِ زندگی مستور ہے

○ محمد حسن گھانوی ایڈووکیٹ

مکرمی، پروفیسر خالد حسین خاں!

یہ آگہی میرے لیے باعثِ مسرت ہے کہ آپ میرٹھ کے بزرگ و معتبر شاعر شری بی ایس جین جوہؔر کے فن اور شخصیت پر ایک وقیع کتاب مرتب کر رہے ہیں۔

یہ امر باعث انبساط ہے کہ میرٹھ کے جن بزرگ شاعروں نے اردو زبان کی آبیاری میں صلہ و ستائش کی تمنا کے بغیر اپنی زندگی کے بیش قیمت ماہ و سال صرف کئے ہیں، ان کی ادبی و شعری خدمات کو ہدیۂ تبریک پیش کرنے اور ان کو اردو قارئین میں روشناس کرانے کے لیے آپ کی یہ کاوش یقیناً لائقِ ستائش عمل ہے۔

مجھے یقین ہے کہ دبستانِ میرٹھ کے وہ بزرگ شعراء و ادباء جو عوام کی نظروں سے ابھی تک پورے طور پر متعارف نہیں ہیں، انہیں منظرِ عام پر لانے میں یہ تخلیق مفید ثابت ہوگی۔ جس سے محبانِ اردو بھی فخر محسوس کریں گے اور آپ کا ادبی مقام بھی تاریخ میں محفوظ ہوگا۔

''بی ایس جین جوہؔر: فن اور شخصیت'' کی اشاعت کے لیے میں اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

محمد حسن گھانوی ایڈووکیٹ

چیئر مین

فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ

موبائل: 09358314187

سبز پیپل کے درختوں پر نزولِ نور ہے

نظم ''حسن اور سرمایہ داری'' میں جوہرؔ نے حسن کا جلوۂ صد رنگ نہایت مؤثر انداز میں، مختلف تشبیہہ واستعاروں کی مدد سے کچھ یوں بیان کیا ہے.....

حسن اور سرمایہ داری، روپ اور سونے کا ہار
باغ میں نورس کلی پر جیسے شبنم کا نکھار
جیسے مظرابِ بہاراں، اور ہو سازِ چمن
ریشمی ساڑی پہ جیسے بیل بوٹوں کی پھبن
اے جوانی گیت گاتی ہیں تیری انگڑائیاں
نیند ہر لیتی ہیں راتوں کی تری رعنائیاں
یہ کنائے سے جو آنکھوں میں لجاتے ہیں تری
دل پہ چرکے سے لگا دیتے ہیں یہ اے لکشمی
گوری گوری نرم باہوں کی سریلی بانسری
روپ ہے یا مسکراتی ہے کنول کی پنکھڑی

جوہرؔ صاحب کی رومانی نظموں میں بعض ایسی ہیں جن میں جذبے کی شدّت، تخیّل کی بلندی اور زندگی کی تڑپ قابلِ دید ہے۔ ذیل میں ایسی نظموں سے بعض اشعار اور نظموں کے نام درج ہیں.....

؎ تج دی سب سنسار کی مایا جھونک دیا ارمانوں کو
میرے لئے تم چھوڑ کے آئی ہو شاہی ایوانوں کو (بن کی پربت)

؎ نظر جو آتے ہیں ہم کو پجاریوں کے گروہ
عوام کے ہیں لٹیرے، بھکاریوں کے گروہ (نجمے)

؎ یا پھولوں کی رانی بن کر

دولت کی دیوانی بن کر
ہو کر جوبن کی متوالی
راج کرو گی انسانوں پر
تم جاؤ گی صبح سویرے (تم جاؤ گی صبح سویرے)

ے دفتروں کے یہ مشاغل، یہ شب روز کے کام
کرسیوں ہی کے لئے وقف یہ ملّت کے امام
عیش و عشرت کے یہ چلتے ہوئے پھرتے ہوئے جام (آؤ تو سہی)

ے تمہیں غم ہے کہ میں اکتا گیا ہوں
محبت کی سہانی زندگی سے
فضائیں سازگارِ عشق ہوتیں
تو میں تم سے محبت کیوں نہ کرتا (.....کے خط کے جواب میں)

ے راہوں پہ اب نہیں ہیں نگاہیں بچھی ہوئی
پگڈنڈیوں کی چلتی ہوئی نبض رک گئی (خوابوں کے ویرانے)

شور مچا ہے ساون آیا گلزاروں پر جوبن آیا
چھم چھم پانی برس رہا ہے ملنے کو جی ترس رہا ہے
صبر کا پیالہ چھلکا جائے
ساون آیا تم نہیں آئے (برہ کا گیت)

ے مجھے عزیز ہے جھنکار بیڑیوں کی اگر
تو پھر یہ پاؤں کا کیوں ساز اٹھا رہی ہو تم (معذرت)
آ گلے مل کے مٹا دیں وہ کدورت دل کی
شمعِ ایوانِ محبت کو فروزاں کر دیں

بیڑیاں ڈال کے تفریق کی ہنستا ہے سماج
جی میں آتا ہے اسے آج پشیماں کر دیں

(پیامِ شوق)

تمہاری شام کو رنگین کرنے آیا ہوں
دوبارہ زندگی میں رنگ بھرنے آیا ہوں
تمہارا حال ہے کیا اور مجھ پہ کیا بیتی
تمام رات یہی بات کرنے آیا ہوں

(سریندر پرکاش جی کے نام)

بزمِ سین جوہرؔ نے جہاں نظموں میں طبع آزمائی کی وہاں غزلوں میں بھی افتادِ طبع کے خاصے جوہر دکھائے۔ آپ کے مزاج میں معاشرہ کی اصلاح اور نفسِ انسانی کی تربیت کا جذبہ موجود ہے۔ غزلوں کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ جوہرؔ نے اس جانب خصوصی توجہ کرتے ہوئے اعلیٰ فن کاری کے نمونے پیش کئے.....

مصیبت میں کوئی مددگار ہوتا　　تو جینا بھی اتنا نہ دشوار ہوتا

غزلوں میں سادگیٔ بیان جوہرؔ کا خصوصی امتیاز ہے۔ وہ شعریوں کہتے ہیں کہ مضمون شعر سامنے کی بات معلوم ہوتی ہے لیکن جب ہم اس کی تہہ کو پہنچتے ہیں تو شعر کی ندرت ہمیں چونکا دیتی ہے.....

یہ ہندو لہو ہے کہ مسلم کا خوں ہے
کوئی جانچ کرنے کا اوزار ہوتا

جوہرؔ صاحب نے اپنے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر عصری مسائل اور ان کے اسباب کو نہایت سنجیدگی و متانت سے زبانِ غزل میں پیش کیا ہے.....

درِ آگہی کھلا ہے تو پڑے ہیں منہ پہ تالے
مجھے بے زبان نہ سمجھو مرے ہونٹ اگر سلے ہیں

رومان انسانی زندگی کا جہاں جزو لاینفک ہے وہاں یہ فطری اور غیر اختیاری جذبہ ہے لہٰذا جوہرؔ بھی اس جذبے سے منحرف نہیں ہوئے۔ اشعارِ ذیل میں ان کا یہ جذبۂ یونیورسل اپنی پوری توانائی اور آب و تاب کے ساتھ کچھ یوں ظاہر ہوا ہے.....

ترا حسن کافرانہ، مرا عشق والہانہ
نہ تجھے خبر تھی اپنی نہ مرا کوئی ٹھکانہ
کبھی مائلِ تکلم، کبھی دل میں ہے تلاطم
کبھی بولنے کی کوشش، کبھی بول بھی نہ پانا

یوں تو اردو غزل ابتداء سے ہی تہذیب و کلچر کی عکاس رہی ہے اور بیشتر شعراء نے اپنے اپنے طور پر غزل میں تہذیبی نقوش ثبت کئے لیکن جوہرؔ کی غزلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جہاں مشترکہ کلچر کی عکاسی اپنی فکر و فن سے کی وہاں ہندوستانی کلچر کی منھ بولتی تصویر کشی بھی کی ہے۔ اشعارِ ذیل میں دھرتی کی بو باس ملاحظہ ہو.....

تری رخصتی کے رتھ پر جو گرائے ہم نے آنسو
وہ دعاؤں کے دیئے ہیں انہیں عمر بھر جلانا
محبت سکھانے پیمبر نہ آتے
ہر اک شخص دھرتی پہ اوتار ہوتا

ان اشعار میں ڈولی اور کہار کے بجائے رتھ کا استعمال، پیمبر کے مقابلے اوتار جیسی ثقافتی اصطلاحوں نے جہاں گہری معنویت پیدا کی وہاں ان سے شاعر کے اس رجحان کی عکاسی بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی جڑوں سے پیوست ہے۔ جوہرؔ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ پیرایۂ اظہار میں تصنع کا عنصر نہیں۔ کیوں کہ وہ مبالغہ آرائی سے گریز کرتے ہیں اور زندگی کی تلخ سچائیوں کو نہایت فنکاری سے بیان کرتے ہیں.....

حسیں مناظر، جواں مسافر، نہ فکرِ منزل، نہ ذکرِ ساحل
فنا کے سیلاب نے جو گھیرا، تو شاخساروں کو ڈھونڈتا ہوں

جوہر صاحب کے مزاج میں انفرادیت اور شعور میں پختگی ہے اسی لئے ان کے یہاں اندازِ بیان اور موضوعات میں تنوع ہے.....

کس کو رہنما کہئے، کس کو ناخدا کہئے
ڈوب جائے جب کشتی پھر کسی کو کیا کہئے
مندر و مسجد و گردوارے میں ماتھا ٹیکا
دل میں لیکن وہی شیطان بنائے رکھا

جوہر کی شاعری کا ایک قابلِ ذکر اور نمایاں وصف یہ ہے کہ ان کی شاعری میں غیر ضروری اور بھاری بھرکم روایتی تراکیب کا استعمال نہیں۔ وہ اپنی بات کو متانت اور سادگی سے کہنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ پائمال کلاسیکی لفظیات کے بجائے جدید تشبیہات واستعارات سے اشعار میں معنی خیزی اور ندرت پیدا کرتے ہیں.....

ہندو و مسلماں دونوں کو مجبور تماشا کر لوں گا
میں دیر و حرم کے پتھر سے اِک جلوہ پیدا کرلوں گا
تسکین کے پھائے رکھوں گا، دکھیاروں پر، بیماروں پر
تلخیِ جہاں کا زخم تو میں دو روز میں اچھا کر لوں گا
تسکین کے ٹھنڈے پانی سے یوں غیظ کی آگ بجھاؤں
گا
سینے سے بگولے اٹھیں گے، آنکھوں سے برکھا کرلوں گا

فارسی لفظیات کے پہلو بہ پہلو جوہر صاحب عام بول چال کے ہندی الفاظ نہایت فنکاری سے اشعار میں اس طرح کھپاتے ہیں کہ کلام کے ترنم میں فرق نہیں پڑتا بلکہ ایسے اشعار عام قاری کو بھی مانوس سے لگتے ہیں.....

سندر، سکھد، سہانی شام اِک جانی پہچانی شام

لال کرن کا پہنے تاج　　سورج کی پٹ رانی شام

تمام رات چھتوں پر برس گیا پانی
سویرا ہوتے ہی بستی میں بس گیا پانی
پیا کی باہوں میں دلہن کو کس گیا پانی
اندھیری رات میں برہن کو ڈس گیا پانی

جوہر نے ہندی شاعری کی طرح اپنی ایک غزل میں اظہارِ عشق عورت کی زبانی نہایت مؤثر انداز میں کچھ یوں کرایا ہے.....

ملنے کی اتم اِچھا تھی، راتوں رات لکھی اِک پاتی
میں دکھیاری غم کی ماری، آنگن چوک بہاروں کیسے
چندا کے رتھ پر وہ آئے سپنوں میں ارمان جگائے
سچ مانوں یا جھوٹا جانوں، کنڈی کھول پکاروں کیسے

ایسے کچھ اشعار کا مجموعہ جن میں کوئی خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا جائے، اردو میں قطعہ کہلاتا ہے، اس میں دو یا دو سے زیادہ اشعار ہو سکتے ہیں لیکن جوہر صاحب نے صرف دو اشعار پر مشتمل بعض نہایت کامیاب اور مؤثر قطعات بھی کہے ہیں جن میں عصری مسائل، زمانے کی بازگشت اور جذباتِ انسانی کی بڑی کامیاب عکاسی ہے۔ قطعاتِ جوہر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر ایک میں مضمون، ایک شعر سے دوسرے شعر میں پیوست ہو گیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جوہر نے ہر قطعہ کا عنوان قائم کر کے اپنی جدّت طرازی کا ثبوت دیا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' میں شامل قطعات کے عنوانات یوں ہیں..... ''زبان''، ''نیا سال''، ''دہشت گردی''، ''المیہ''، ''خالی ہاتھ''، ''مذہب''، ''خدا ایک''، ''لیڈر''، ''دعا''، ''سیلابِ غم''، ''کنارہ''، ''شغل مے''، ''عشق''، ''پری زار''، ''غم''، ''تیرِ نظر''، ''پلکوں کے سائے''، ''آس''، ''جوانی''، ''حسن''، ''زلف و رخسار''، ''سراپا''، ''شاعری''، ''فنکار''، ''عمر رفتہ''، ''ایک سوال''، ''زندگی''، ''تنہائی

میں''، ''متاعِ سخن''، ''زوال''، ''رقم''، ''انسان''، ''آخری مرحلہ''، ''کلامِ شاعر''، ''چند روزہ زندگی''، ''دوبارہ جنم''، کل سینتیس لیکن قطعہ بعنوانِ ''زندگی'' صفحہ دوسو چھپن اور ''چند روزہ زندگی'' صفحہ دوسو ساٹھ میں یکساں اشعار ہیں لہٰذا اس طرح چھتیس قطعات ہوئے۔ واضح ہو کہ صفحہ دوسو چون پر درج قطعہ بعنوانِ ''زندگی'' الگ مضمون کا ہے۔ مذکورہ سبھی قطعات اپنے عنوان کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

مجموعے کے آخر میں جوہر صاحب نے اپنے بارہ مؤثر دوہے بھی شامل کئے ہیں جو اپنی لطافت و شیرینی کے اعتبار سے لاجواب ہیں۔ ان کے مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ ہر دوہے میں مضمون کی ایک دنیا آباد ہے۔ مثلاً.....

سندر سندر انکھڑیاں کومل کومل ہات　　بستے ہیں آواز میں کوئل کے نغمات

زخمی ہے انسانیت دکھیا ہے سنسار　　پھر بھی اس ماحول سے کوئی نہیں بیزار

''ترانۂ بیداری'' کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ شعری مجموعہ اسم بامسمّیٰ ہے یعنی قدم قدم پر شاعر نے اپنی فکر و فن کو بروئے کار لاتے ہوئے آج کے انسان کو بیدار کیا ہے۔ جوہر صاحب نے اپنی شاعری کی بنیاد، زبان کی لطافت اور فکر کی ندرت پر رکھی ہے۔ شاعری کا لہجہ ہندوستانی، انداز عوامی اور عام فہم ہے جس میں ہندی کے نرم و شیریں الفاظ کی گلکاری کرتے ہوئے جوہر نے انسان اور اس کی ذات اور ذات کے حوالے سے کائنات کی تشریح کی ہے۔ جوہر صاحب حقائقِ زندگی کا ادراک کچھ اس طرح کراتے ہیں کہ ان کی شاعری دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ شاعری میں رمزیت و اشاریت ہے۔ سادگی و سلاست اور فطری انداز ہے۔

غلطی لازمۂ بشر ہے۔ پیشِ نظر مجموعہ میں بھی بعض بے کیف اور واعظانہ اشعار در آئے ہیں۔ مثلاً.....

ایک پل چین ہے نہ راحت ہے　　میرے دل کی عجیب حالت ہے

تم اپنے دھیان میں ڈوبی ہوئی ہو تمہاری اوڑھنی لہرا رہی ہے

کاش اے عورت کہ تو اس زندگی سے اوب جائے

کاش تجھ کو کوئی زہریلی فضا سے کھینچ لائے

ایسے اشعار جوہر کی شاعری میں نہ کے برابر ہیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ کسی شاعر کی شاعرانہ صلاحیت اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کمزور اور غیر معیاری اشعار کی بنیاد پر نہیں بلکہ اچھے، مؤثر اور معیاری اشعار سے کیا جاتا ہے۔ جوہر صاحب کی شاعری جذبات و احساسات کا آئینہ ہے جس میں عقل و شعور کی سیّال کیفیت اور حسیّت کی فراوانی ہے۔ تلخ حقیقتوں کا عرفان ہے۔ شاعری میں انسانی اخوت، قومی یکجہتی اور نظریۂ سیکولرزم کی عکاسی ہے۔

جوہر کی شاعری میں ان کے نام کی خصوصیات و اثرات یہ ہیں کہ ان کی شاعری انسان کو حوصلہ و توانائی عطا کرتی ہے۔ دلوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کرتی ہے۔ جوہر صاحب کی پرواز تخیّل شاہین کی طرح بلند و بالا اور منفرد ہے۔ اب آیئے ذرا تخلّص کے معنی اور شاعری پر اس کے اثرات پر مختصر گفتگو ہو جائے۔ اس مضمون کے ابتدائی حصّے میں ''جوہر'' کے دو معنی مذکور ہیں یعنی ''عطر'' یا ''ست'' اور ''وہ چیز جو خود قائم ہو''۔ جوہر کی شاعری میں ایک طرح سے سماجی مسائل اور جذباتِ انسانی کا ''عطر'' یا ''ست'' کھنچا نظر آتا ہے۔ انھوں نے معاشرہ و انسان کے گوناگوں مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

شاعرِ بیباک جناب جوہر صاحب نے یوں تو حضرت علّامہ سیماب اکبر آبادی کی شاگردی اختیار کی لیکن وہ ان کے نزدیک رہ کر دامنِ تربیت میں نہیں پلے۔ جوہر نے بذریعہ ڈاک اپنے بعض اشعار کی محض اصطلاح کرائی۔ زیادہ تر جوہر کے شوقِ شاعری اور مشقِ سخن نے ان کے قدم میدانِ شاعری میں جمائے۔

OO

Dr. Mohd. Aslam (Head)
Urdu Dept., Ganna Utpadak P. G. College,
Baheri (Bareilly)
Phone : 05822-222724

○ سیّد احمد سحرؔ شاہجہان پوری

بی ایس جین جوہرؔ "ترانۂ بیداری" کے آئینہ میں

دنیا کے نقشہ پر ہمارا ملک ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں جتنے صوبے ہیں تقریباً اتنی ہی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ بقول کسے "ہر دو سو قدم پر بولی بدل جاتی ہے اور آپس میں ایک دوسرے کی بات پوری طرح سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔" لیکن اردو زبان ہی ایک ایسی زبان ہے جو اتر سے دکھن اور پورب سے پچھم تک سارے ملک میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اسی ملک میں پیدا ہوئی، یہیں جوان ہوئی اور اپنے حسن و رعنائی سے سارے ملک کو منور کر دیا۔ اس کی مٹھاس نے ہر قوم، ہر ذات اور ہر مذہب کے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا اور ہر دل عزیز بن گئی۔ اس نے اپنے وطن میں بولی جانے والی تمام زبانوں اور غیر ممالک سے آ کر یہاں بس جانے والوں کی زبان کے خوبصورت، شیریں، بامعنی، اثر انگیز اور روزمرہ کے الفاظ کا خزانہ سمیٹ لیا اور اہلِ وطن کے جذبات، احساسات اور خیالات کے اظہار کا موثر وسیلہ بن گئی اور بلا امتیازِ مذہب و ملت، ہر مذہب کے اہلِ قلم نے اردو نظم و نثر میں اپنے اپنے فن کے جوہر دکھا کر اس کو گنگا جمنی تہذیب کا مُرقع بنا دیا۔

مشرق میں ہندی کے ادیبوں نے ہندی شبدوں سے عجم اور عرب والوں نے فارسی، عربی اور ترکی کے الفاظ سے اس کا دامن بھر دیا اور جب مغرب والوں نے یہاں قدم رکھا تو انگریزی، فرانسیسی، لاطینی زبانوں سے اس کو مالا مال کر دیا۔ اس طرح یہ زبان ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بدھ، جینی، غرض ہر مذہب و ملت کے فنکاروں کی منظورِ نظر بن گئی۔ ان تمام ادیبوں اور شاعروں کا اگر اس مضمون میں تذکرہ کیا جائے تو یہ مضمون ان ناموں کی فہرست بن کر رہ جائے گا۔ ایسے ہی سخنورانِ اردو میں ایک نام بی ایس جین جوہرؔ صاحب کا ہے جنہوں نے اپنی ساری عمر گیسوئے اردو سنوارنے میں صرف کر دی اور یوں "ترانۂ بیداری" کا گراں قدر تحفہ اردو ادب کو پیش کر دیا۔

بی ایس جین جوہر صاحب میرٹھ کے انقلابی شہر کے رہنے والے ہیں۔ بقول خود جوہر صاحب نے ۱۹۲۷ء میں جنم لیا یعنی انہوں نے پوری بیسویں صدی میں ساری دنیا اور خصوصاً اپنے ملک میں پیش آنے والے تمام انقلابات کو جاگتی آنکھوں سے دیکھا اور ان کا بھرپور جائزہ لیا۔ اس طرح ان کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ نہایت وسیع اور عمیق ہے۔ انہوں نے بڑے فخر سے اس بات کا اعتراف کیا کہ ان کی خاندانی زبان اردو تھی۔ ان کے والد بھی شاعر تھے۔ اس طرح شاعری ان کو ورثہ میں ملی، پھر گھر سے مدرسہ اور کالج تک اردو اساتذہ اور ادباء و شعراء کی صحبت میسّر رہی۔ ان کو بارہ برس کی عمر سے شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا اور خوش قسمتی سے سیمابؔ اکبر آبادی جیسے عظیم شاعر اور استاد کا تلمذ حاصل ہو گیا۔ یوں ان کی شاعری پروان چڑھتی رہی جو آج تک ان کے دلی جذبات اور احساسات کے اظہار کا وسیلہ اور تسکینِ قلب کا ذریعہ ہے۔ ۱۹۲۷ء میں اگر ہم پندرہ برس جوڑ دیں تو ۱۹۴۲ء بنتا ہے یعنی آزادیِ وطن سے صرف پانچ سال قبل کا زمانہ، یہی زمانہ جوہر صاحب کے عنفوانِ شباب کا زمانہ ہے جو آرزوؤں، ارمانوں امنگوں اور جوش و خروش کا زمانہ ہوتا ہے لیکن یہی زمانہ وطنِ عزیز کی جنگِ آزادی کی سرگرمی اور دوسری جنگِ عظیم کی ہولناکی اور عذاب کا بھی ہے۔ ایسے ماحول اور ایسی فضا میں کوئی فنکار ملک کو درپیش مسائل سے آنکھیں نہیں چرا سکتا تھا چنانچہ جوہر صاحب بھی چشم پوشی نہیں کر سکے اور روحانی افکار کے ساتھ ساتھ ہنگامی، سیاسی اور انقلابی موضوعات کو بھی جوہر صاحب نے بڑے پرزور لیکن انتہائی شائستہ انداز میں اپنا موضوعِ سخن بنایا۔

ان کی کتاب ''ترانۂ بیداری'' میں انیس (۱۹) نظمیں شامل ہیں اور یہ سب نظمیں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک کی ہیں۔ اس لئے ان نظموں میں حسن و عشق اور ہجر و وصال کے جذبات کی عکاسی کے ساتھ ہر جگہ ولولۂ انقلاب کی گونج شامل ہو جاتی ہے۔ میرے دعوے کی پہلی دلیل کتاب کا نام ''ترانۂ بیداری'' کی پہلی نظم ''ترانۂ بیداری'' ہے جو شروع اس بند سے ہوتی ہے کہ :

جاگ اٹھو اے سونے والو! سب کچھ پا کر کھونے والو!
خلوت کی تاریک فضا میں اشکوں سے منہ دھونے والو!
تم نے اپنی قدر نہ جانی

○ ڈاکٹر بشیر بدرؔ

پیغامِ تہنیت

آپ سے بذریعۂ فون، تفصیلی گفتگو سے مجھے علم ہوا کہ آپ میرٹھ کے مُعمّر و مُستند اور دبستانِ سیمابؔ کے آخری حیات شاعر شری بی۔ایس۔جین جوہرؔ کی حیات اور شعری خدمات پر ایک تخلیق مُرتّب کر رہے ہیں۔

پروفیسر خالد صاحب! آپ کی بے لوث اردو خدمات اور نثری نگارشات کا میں عرصہ سے قائل ہوں۔ہم دونوں نے میرٹھ یونیورسٹی کے سب سے قدیم میرٹھ کالج کے شعبۂ اردو میں کم و بیش دو عشرے ایک ساتھ درس و تدریس میں گذارے ہیں، آپ کی ایمانداری، جانفشانی، آپ کی صلاحیت اور آپ کی قلمی کارگذاریوں کو مجھ سے بہتر اور کون سمجھ سکتا ہے! آپ کا امتیاز یہ ہے کہ آپ اردو کے عمومی پروفیسروں اور قلمکاروں کے برخلاف، جوڑ توڑ اور جی حضوری سے ہمیشہ دور رہے ہیں اور اردو کے تئیں خاموشی اور لگن سے اپنے فرائضِ منصبی ادا کر رہے ہیں۔

شری بی۔ایس۔جین جوہرؔ (میرٹھی) جیسے اردو کے خاموش فِدائی اور شیدائی کے فکر و فن پر آپ جس اردو خدمت کو روبہ عمل لا رہے ہیں، یہ امر لائقِ ستائش ہے کہ میرٹھ کے عوام و خواص اور اردو شاعری کے متوالوں کو آپ جوہرؔ صاحب کے شعری جوہروں سے شناسا کر رہے ہیں۔آپ کے اس ادبی قدم سے، میرٹھ کے عوام خصوصاً اور اردو دنیا کے قارئین عموماً، جوہرؔ صاحب کی شاعری سے نہ صرف واقف ہوں گے بلکہ جوہرؔ صاحب کا نام، کام اور شعری مقام بھی سخنوروں میں شامل ہوگا۔

اس تخلیق کے لئے میری نیک خواہشات اور دلی مبارکبادیاں آپ کے لئے ہیں!

Bashir Badr

Chairman, Madhya Pradesh Urdu Akademy, Bhopal (M. P.)
Phone : 0755-2547018

یہ نظم جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی ہے زورِ بیان بھی بڑھتا جاتا ہے اور ولولہ انگیز ہوتی جاتی ہے۔

دوسری نظم ''مذہب'' ان کی کشادہ ذہنی اور وسعتِ خیال کی دلیل ہے۔ مذہب کے نام پر بیجا تعصب، ہٹ دھرمی جیسی بدعنوانیوں پر دکھ کا بھرپور اظہار کیا ہے اور گاندھی جی کو اہنسا کا اوتار اور ان کی قیادت وطنِ عزیز کے لئے نہایت مبارک بتایا ہے۔ اگلی نظم ''محبت کس طرح کرلوں'' میں شاعر عالم گیر محبت اور اخوت کا سبق دینے کے لئے اپنی محبوبہ کی محبت کو قربان کرتا ہے اور کہتا ہے :

نظر میں کانپتا ہے اک جہنمِ زار کا منظر
تخیل کے شبستاں میں دلِ بیدار کا منظر
لرزتے ہیں نگاہوں میں پرخچے زندگانی کے
ہیں کتنے مضحکہ خیز آج ارماں گلفشانی کے
ہیں خاک وخون میں لتھڑی ہوئی لاشوں کے پشتارے
فضائیں دہر کی برسا رہی ہیں سرخ انگارے
بتاؤ تو سہی تم سے محبت کس طرح کرلوں

اسی طرح ان کی ہر نظم ملک میں پھیلی ہوئی نفرت، مذہبی تعصب، نفاقِ باہم، فرقہ پرستی، بے حسی، بدعملی، غلامی اور ظلم وجور کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کا سبق دیتی ہے۔ وہ فطرت کی نیرنگیوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی نظم ''اوشا'' اور ''وفا کی دیوی'' جیسی رومانٹک نظمیں اسی تاثر کا آئینہ ہیں۔ ''درسِ آدمیت'' جنگ کی دہشت اور تباہ کاریوں سے نفرت اور بیزاری کے ساتھ ساتھ امن ووامان کی زندگی گزارنے کا سبق دیتی ہے۔ یہ بند دیکھئے.....

میرے سینے میں لرزتا ہے وہ ایمان کا نور
جس سے تاریکیاں رہتی ہیں سدا دور ہی دور
تجھ کو مذہب میں رہے عقل وعقیدت کا شعور
یاد رکھ! بھول نہ انسان کہ مرنا ہے ضرور

اے پرندے کبھی پرواز کی طاقت پہ نہ پھول
سیر کر خوب مگر اپنے نشیمن کو نہ بھول

وہ مذہب کی دیوار کو محبت کے راستے میں آنے دینے کے قائل نہیں۔ ان کی نظم ''نجمہ سے'' کا یہ بند دیکھئے:

تری طرح میں یہ ٹسوے بہا نہیں سکتا
مگر یہ چوٹ بھی ہرگز بھلا نہیں سکتا
طلسمِ مذہب و اقوام ہے جمالِ فریب
یہ تیرے شیخ و برہمن ہیں باکمالِ فریب
ٹکڑ گداؤں کی روٹی پہ دانت رکھتے ہیں
یہ آدمی کو نگاہوں سے ہی پرکھتے ہیں
گراں ہیں ان پہ ہمارا یہ پیار اے نجمہ
اے میری جانِ عزیز

نظر جو آتے ہیں ہم کو پجاریوں کے گروہ
عوام کے ہیں لٹیرے بھکاریوں کے گروہ
انہیں کے ہاتھ میں نجمہ ہے مذہبوں کی عنان
اٹھا رہے ہیں یہ مذہب کی آڑ میں طوفان
نہ ان کے سینے میں دل ہے نہ کوئی جوش وخروش
میں جانتا ہوں معطل ہیں ان کے چشم و گوش
سنے گا کون ہماری پکار اے نجمہ
اے میری جانِ عزیز

جوہر صاحب نے روایت کی پوری پاسداری کی ہے، سب نظمیں پابند ہیں اور زبان وبیان اور عروضی پابندیوں کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ اردو زبان کو انہوں نے واقعی اردو زبان کی طرح برتا ہے

جس میں سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی مثلاً لیونڈر، پاؤڈر، اپ ٹو ڈیٹ، ووٹ، ڈگری جیسے الفاظ کے ساتھ برہا، بھاگ، ٹسوے، پرنچے، تشدد، تعصب وغیرہ الفاظ نگینے کی طرح جڑ دئے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں ۳۵ غزلیات، ۳۸ قطعات اور ۱۲ دوہے ہیں۔ غزلوں میں بھی انہوں نے آزادی کے نغمے گائے ہیں اور فرسودہ روایات کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ قربانی وایثار، اخلاق ومحبت، ایکتا، یکجہتی کا درس دیا ہے اور غمِ دوراں کے ساتھ غمِ جاناں کو بھی گلے لگائے رکھا ہے۔ مشتے از خروارے ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں :

تلاش کرتا ہوں دوسروں کی خوشی میں تکمیل حسرتوں کی
میں اپنی خوں گشتہ آرزوؤں کے لالہ زاروں کو ڈھونڈتا ہوں
سنا تھا جن پر بہ یادگارِ غمِ شہیداں لگیں گے میلے
میں راج پتھ پر سجے مزاروں میں ان مزاروں کو ڈھونڈتا ہوں

ہندو و مسلماں دونوں کو مجبورِ تماشا کرلوں گا
میں دیر وحرم کے پتھر سے اک جلوہ پیدا کرلوں گا

یہ ہندو لہو ہے کہ مسلم کا خوں ہے
کوئی جانچ کرنے کا اوزار ہوتا

یہ حال اپنا ہوا ہے شدتِ خطراتِ پیہم سے
تحفظ کی جو تھی امید اب کم ہوتی جاتی ہے

مندر و مسجد و گردوارے میں ماتھا ٹیکا
دل میں لیکن وہی شیطان بنائے رکھا

عمر کیا دھار پہ بہتی ہوئی اک ناؤ سی ہے
زندگی ریت کی دیوار نظر آتی ہے

میرے من کا کنول کھلے نہ کھلے
تیرے تن کا حسیں گلاب کھلے

بات غیروں سے تو ہنس ہنس کے کیا کرتے ہو
ہم سے ہوتے ہی ملاقات خفا ہوتے ہو

انہوں نے اپنی غزلوں اور نظموں میں ہر جگہ جیتی جاگتی عورت سے خطاب کیا ہے یعنی غزل کو اپنے لغوی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ چھوٹی بحروں میں بڑے اچھے اور معنی خیز قطعات کہے ہیں۔ قطعات میں مطلع ضروری نہیں ہوتا لیکن خود کو مطلع کا پابند بنا کر قطعہ لکھے ہیں اور ہر قطعہ موضوع کے اعتبار سے عنوان کے تحت ہے۔ ذیل کا قطعہ ان کے فن کا آئینہ دار ہے جو ''زبان'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں ہندی اور اردو دونوں زبانوں سے ان کی بے پایاں محبت کا اظہار ہے.....

.....زبان.....

جس میں بچے زبان کھولتے ہیں
جس میں من کی مٹھاس گھولتے ہیں
ہندی اردو کا جھگڑا مٹ جائے
ہم وہ لکھیں جو گھر میں بولتے ہیں

اسی لئے ''ترانۂ بیداری'' ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع ہوئی ہے۔ یہ ایک اچھی مثال ہے۔ اس سے ہندی بھاشی بھی اردو کے مال ومتاع اور محاسن سے روشناس ہوسکیں گے اور ملک میں اتحاد، ایکتا اور یکجہتی کا ماحول بنے گا۔ ان کے کلام میں ان کا عہد پوری طرح جلوہ گر ہے۔

جوہر صاحب اب فارغ البال ہیں اور دوبارہ شاعری میں مصروف ہیں میری دعا ہے کہ وہ تادیر اسی طرح اردو ادب کو ایسے جوہرِ سخن سے مالا مال کرتے رہیں۔

OO

Sayed Ahmed Sahar
Khaleel Gharbi, Near National Girls Inter College,
Shahjanpur-242001
Ph : 05842-222612

○ ڈاکٹر رضیہ حامد

میرٹھ کا جوہرؔ تابدار

شمالی ہند میں میرٹھ ایک ایسا شہر ہے جسے اردو زبان وادب کا گہوارہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس شہر نے محبِ وطن شاعر اسمٰعیل میرٹھی کو پیدا کیا جنہوں نے بیک وقت وطن کی عظمت کے نغمے بھی گائے اور بچوں کی ذہنی تربیت کے لئے نہایت معیاری ادبِ اطفال بھی تخلیق کیا جو آج تک اردو کی نصابی کتابوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ میرٹھ نے ہی بیاںؔ میرٹھی، عیاںؔ میرٹھی، اور غزل کے بڑے بڑے شاعر پیدا کئے۔

ماضی قریب میں شمسؔ میرٹھی، ندرتؔ میرٹھی، اظہارؔ میرٹھی، حفیظؔ میرٹھی جیسے غزل گو اردو شاعری کے چاند ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب میرٹھ کالج اردو تعلیم کا ایک بڑا مرکز تھا۔ شہر میں ہر جگہ علم وادب کا چرچا تھا۔ محلے محلے مشاعرہ ہوا کرتے تھے اور نوچندی کے میلے کا مشاعرہ تو مشاعروں کی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔ طلباء میں شعر گوئی کا ذوق فراواں تھا۔ بی ایس جین جوہرؔ بھی ان ہی ہونہار طلباء میں تھے جن کا شاعرانہ ذوق ادبی ماحول میں پروان چڑھ رہا تھا۔ ان کے ابتدائی دور کا شعر ان کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے.....

؎ اس دل میں موجزن ہے جذبات کا سمندر
تھامے نہیں تھمیں گی ایسی روانیاں ہیں

جوہرؔ صاحب نے اپنے ہم چشموں میں امتیاز حاصل کیا اور علامہ سیمابؔ اکبر آبادی کو اپنی کچھ غزلیں بھیجیں اور انہوں نے جوہرؔ صاحب کو اپنے زمرۂ تلامذہ میں شامل کر لیا گرچہ وہ چند

ہی غزلیں سیمابؔ صاحب کو دکھا سکے۔

بی ایس جین جوہرؔ کا تعلق تجارت پیشہ خاندان سے ہے۔ اس لئے تعلیم سے فراغت کے بعد تجارت میں لگ گئے مگر شاعری کے بارے میں کسی نے سچ کہا ہے.....

''چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی''

وہ شعر کہتے رہے، کبھی کبھی رسائل میں چھپتے بھی مگر جو ذوق وشوق ان کو ابتداء میں تھا وہ باقی نہ رہ سکا۔ اب تقریباً نصف صدی کے بعد ڈاکٹر خالد حسین خاں اور جناب رفعت سروش کی ہمت افزائی سے انہوں نے اپنے کلام کے منتشر اوراق جمع کئے اور ''ترانۂ بیداری'' کے عنوان سے ایک خوبصورت کتاب ''نورنگ کتاب گھر'' نے شائع کی ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اردو رسم الخط اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں منظرِ عام پر آئی ہے۔

یہ کتاب صوری اعتبار سے ہی نہیں معنوی اعتبار سے بھی منفرد ہے۔ جوہرؔ صاحب نظم گوئی کی طرف پہلے مائل ہوئے۔ اس زمانے میں سیمابؔ اکبرآبادی کے شاگرد ساغرؔ نظامی بھی میرٹھ میں رہتے تھے چنانچہ جوہرؔ صاحب کی کچھ نظمیں ساغرؔ صاحب کے اسی دور کی یاد دلاتی ہیں۔ ان نظموں میں ''ترانۂ بیداری''، ''محبت کس طرح کرلوں'' وطنیت کے رنگ میں ڈھلی ہوئی ہیں.....

زمانے کی فضا میں مجھ کو بو بن کر بکھرنا ہے
ازل سے اونگھتی دنیا کو اب بیدار کرنا ہے
خرد کا جال مجھ کو پھینکنا ہے آسمانوں پر
اٹھانا بوجھ دنیا کا ہے سارا اپنے شانوں پر
جہاں سے نام اٹھ جائے گا اک دن بربریت کا
سبق دینا ہے عالمگیر اخوت اور محبت کا
بتاؤ تو سہی تم سے محبت کس طرح کرلوں

منظر کشی اردو شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ جوہرؔ صاحب کو انگریزی شاعری سے بھی ذوق

رہا ہے۔اس مناسبت سے ان کی نظم ''اوشا'' انکے رنگِ سخن کو ظاہر کرتی ہے.....

؎ چمن میں رنگیں قبا پہن کر سحر کی دیوی ہے جلوہ گستر
حسیں کلیوں کی انکھڑیوں میں خوشی کے آنسو چھلک رہے ہیں
نسیمِ فردوس چل رہی ہے گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے
ہوا سے شاخیں لچک رہی ہیں ادا سے پودے لہک رہے ہیں
صبا نے آ کر کلی کلی کے رُخِ حسیں سے نقاب اٹھا دی
ہوئی ہیں کلیاں بھی پانی پانی سَروں سے پلّو کھسک رہے ہیں

لیکن وہ صرف مناظرِ قدرت میں گم نہیں ہو جاتے بلکہ شاعر سے مخاطب ہوتے ہیں اور اس تمنا کا اظہار کرتے ہیں کہ شاعر کو فطرت کا پجاری ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کے مسائل سے بھی آگاہ ہونا چاہئے اور اسے ایسا پیغام دینا چاہئے جس سے محبت اور رواداری کی فضا قائم ہو:

؎ چھیڑ وہ نغمہ جو شعلوں پر برسے بن کے شبنم
پیار و محبت کی لے میں ہو سات سُروں کا سنگم
ایسا کچھ لکھ جس سے بدلے کہنہ نظمِ عالم
اور رواداری پر آخر ہو یہ دنیا قائم

اے شاعر، اے حسن کے شیدا، اے فطرت کے پجاری

دوسری جنگِ عظیم نے دنیا کو شعلۂ زار بنا دیا تھا۔اس کُرّہِ ارض کا ہر خطہ کسی نہ کسی طرح جنگ سے متاثر تھا تو بھلا یہ کب ممکن تھا کہ جوہر صاحب جو کہ حساس شاعر ہیں، جنگ کی تباہیوں سے متاثر نہ ہوں۔شاعر کے دل میں تو سارے جہاں کا درد ہوتا ہے۔۱۸/جنوری ۱۹۴۳ء کو کہی ہوئی نظم ''درسِ آدمیت'' اس دور کی نظمیہ شاعری کی نمائندگی کرتی ہے جس میں جوہر صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں کو پیش کیا ہے۔ایسی نظموں کا مطالعہ آج صرف شاعری ہی نہیں تاریخ کا مطالعہ بھی ہے.....

ے بحرِ تہذیب میں برپا ہے یہ طوفان کا شور
ہے قیامت کی صدا فتنہ گر انسان کا شور
سینۂ تیرہ و تاریک میں ارمان کا شور
توبہ توبہ کہ یہ اس بے سرو سامان کا شور
آدمیت کے اصولوں کا جنازہ ہے یہ جنگ
خونِ انسان کی ہولی کا تماشا ہے یہ جنگ

جوہر صاحب کی نظموں میں تنوع ہے۔ زندگی کے مختلف رنگوں کی دھنک ان کی شاعری میں ملتی ہے۔ وہ دور بیک وقت انقلابی تحریک کا بھی تھا اور رومانی تحریک کا بھی تھا..... ''یہ قصہ جب کا کہ آتش جوان تھا۔''

جوہر صاحب کے یہاں خوبصورت رومانی نظمیں ہیں جو اس دور کی رومانی شاعری کا آہنگ پیش کرتی ہیں۔ ان کی ایک نمائندہ رومانی نظم ہے..... ''نجمہ سے''..... اس عنوان کے ساتھ ہی اردو شاعری کے کئی رومانی نام ذہن میں گھوم جاتے ہیں۔ اختر شیرانی کی ''سلمیٰ اور عذرا''، احمد ندیم قاسمی کی ''صبوحی''، جاں نثار اختر کی ''انجم'' اور جوہر صاحب نے ''نجمہ'' کو اپنے شعروں کی زینت بنایا ہے۔ انہوں نے اس نظم میں ایک رومانی کہکشاں تخلیق کی ہے.....

ے یہ کالی کالی گھٹائیں اداس ہیں نجمہ
یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اداس ہیں نجمہ
خموشیاں سی مسلط ہیں کوہساروں پر
عجیب رنگ ہے چھایا ہوا بہاروں پر
سرودِ غم کا مغنّی ہے آج آبِ رواں
سسک رہا ہے یہ چشمے کا کیوں شباب رواں
ڈرا رہی ہے مجھے کیوں بہار اے نجمہ.....

جوہر صاحب کی رومانی نظمیں آج کے قارئین کو بھی دعوتِ مطالعہ دیتی ہیں کیونکہ جذبۂ عشق و محبت جوان رہتا ہے اور محبت کے تجربے ہر دور میں انسان کو عزیز ہیں۔ جوہر صاحب نے غزلیں بھی ذوق و شوق سے کہی ہیں جن میں کلاسیکل رنگِ سخن کی نمائندگی ہے اور پختگیٔ کلام کی وجہ سے وہ غزلیہ شاعری میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔ چند شعر مطالعہ کے لئے پیش ہیں.....

؎ خزاں کی آمد کے ڈر کے مارے لٹی بہاروں کو ڈھونڈتا ہوں
شباب کی منزلوں سے بھٹکا جواں سہاروں کو ڈھنڈتا ہوں
حسیں مناظر، جواں مسافر، نہ فکرِ منزل، نہ ذکرِ ساحل
فنا کے سیلاب نے جو گھیرا، تو شاخساروں کو ڈھونڈتا ہوں

؎ ترا حسن کافرانہ، مرا عشق والہانہ
نہ تجھے خبر تھی اپنی ، نہ مرا کوئی ٹھکانہ

؎ ہندو و مسلماں دونوں کو مجبور تماشا کرلوں گا
میں دیر و حرم کے پتھر سے اک جلوہ پیدا کرلوں گا

؎ عہدِ وفا کسی سے، محبت کسی کے ساتھ
کیوں کھیلتے ہیں آپ مری زندگی کے ساتھ

؎ غم سے اپنی تو دوستی سی ہے
اور ملاقات روز کی سی ہے

؎ عارض و گل کے ماہتاب کھلے
کچھ تو سچ مچ ہی لاجواب کھلے
صبح کی دھوپ میں گلاب کھلے
زلف کے سائے میں شباب کھلے

ے وہی جنسِ وفا آخر فراہم ہوتی جاتی ہے
محبت کی حقیقت بھی مسلّم ہوتی جاتی ہے

ے مرا دل سادگیٔ حسن فطرت کا پجاری ہے
جمالِ لالہ و گل پر مجھے حیران رہنے دو

ے رات تو رو رو کر کاٹی ہے، دن میں وقت گزاروں کیسے
کوئی نہ سدھ لینے آئے گا، من میں یہ بات اتاروں کیسے

ے کس کو رہنما کہیئے، کس کو ناخدا کہیئے
ڈوب جائے جب کشتی، پھر کسی کو کیا کہیئے

غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوہر صاحب کا ذوقِ سخن کتنا رچا ہوا ہے اور ان کے یہاں ادب کی قدروں کا کتنا احترام ہے۔

بی ایس جین جوہر بلاشبہ ان بزرگ شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے ایک زمانہ دیکھا ہے۔ اپنے تجرباتِ زندگی کو اپنی شاعری میں بہ حسن و کمال ادبی دیانتداری اور ایمانداری سے پیش کیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ تقریباً اسّی سال کی عمر میں بھی وہ فعّال ہیں۔ ان کا تازہ کلام رسائل کی زینت بنتا رہتا ہے۔ اردو کو اپنے ایسے ہی باکمالوں سے بڑی امیدیں ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی بدولت اردو شاعری کا سیکولر منظر نامہ مرتب ہو رہا ہے۔

OO

Dr. Razia Hamid
6-Kinara Apartments, V. I. P. Lake View Road,
Bhopal (M. P.)

○ ڈاکٹر خلیق انجم

۲۱/اگست ۲۰۰۶ء

جوہر صاحب آداب!

چند دن پہلے ملاقات ہوئی تھی جس میں ڈاکٹر خالد صاحب اور آپ سے جو گفتگو ہوئی وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس ملاقات میں آپ نے میرا دل جیت لیا۔ اس ملاقات میں آپ نے اپنی شرافت، نیکی اور اندازِ گفتگو سے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کر لیا۔

پچھلے سات سو برس میں ہمارے ہندو مسلم بزرگوں کی کوشش سے جو ہند ایرانی تہذیب وجود میں آئی وہ آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی ہے اور اب اگر کوئی مجھ سے تہذیب کی وضاحت چاہے تو میں اسے مطمئن نہیں کر سکتا۔ ہاں! میں اس تہذیب کا ایک نمونہ پیش کر سکتا ہوں اور وہ آپ ہیں۔ اعتراف کرتا ہوں کہ آپ کے نام سے تو واقف تھا اور آپ کے دو چار شعر بھی سنے تھے لیکن عدمِ واقفیت کی وجہ سے آپ کے فنی صلاحیتوں کا معترف نہیں تھا۔ آپ نے اپنا مجموعۂ کلام ''ترانۂ بیداری'' عنایت فرمایا۔ میں نے اس کا شروع سے آخر تک مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ آپ سیمابؔ اکبر آبادی جیسے ممتاز و مشہور شاعر کے شاگرد ہیں۔ میں نے آج تک سیمابؔ اکبر آبادی کے کسی بھی شاگرد کی شاعری میں فنی نقص نہیں دیکھا۔ یہی حال آپ کا ہے۔ آپ کی زبان کیسی صاف، سادہ رواں اور شگفتہ ہے۔ آپ کے کلام کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ آپ فکر و خیال کے مالک ہیں۔ اظہارِ بیان پر آپ کو قدرت ہے۔

آج کل غیر ارادوں تو کیا خود بعض اردو والے تعصّب کا شکار ہو کر یا معمولی منفعت کے لئے کچھ کھلم کھلا اور کچھ پوشیدہ طور پر اردو زبان پر ناز یبا حملے کر رہے ہیں حالانکہ ان کا آج جو مرتبہ ہے وہ اردو زبان ہی سے ہے۔ اسی زبان نے انہیں شہرت اور عزت دی ہے۔

مجھے آپ کا یہ بیان بہت پسند آیا ہے کہ آپ کی خاندانی زبان اردو ہے۔ میرے والد

مذہبی ہم آہنگی کے علم بردار

بی ایس جین جوہر صاحب اچھے شاعر ہیں۔ یہ معلوم ہو کر حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ اردو شاعری میں غیر مسلم شعراء کی اچھی خاصی تعداد ہے اور بہ لحاظِ شہرت و مقبولیت بھی کسی سے کم نہیں۔ پنڈت دیا شنکر نسیم، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، جگن ناتھ آزاد، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، کرشن بہاری نور، چندر پرکاش جوہر بجنوری وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان سبھی شعراء نے اردو شاعری کو اپنا کر اس کے عزت و وقار میں اضافہ کیا۔ اردو کو گنگا جمنی تہذیب سے آراستہ کیا۔

جوہر صاحب بھی اردو شاعری سے عشق کرتے ہیں۔ اسے زندگی کے ہر گوشے سے قریب رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ جوہر صاحب اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ جوہر صاحب نے نظمیں اچھی اچھی تخلیق کی ہیں۔ بامقصد اور سماجی مسائل سے جڑی نظمیں ہیں۔ ''ترانۂ بیداری''، ''مذہب''، ''محبت کس طرح کرلوں''، ''تم جاگو گی صبح سویرے''، ''آؤ تو سہی'' وغیرہ ہیں لیکن میں ان کی غزلوں کا جائزہ پیش کرنا چاہتا ہوں..... ''تنہائی''، ''دنیا''، ''گھر''، ''احساس''، ''دعا''، ''زندگی''، ''زورِ غم'' کو استعارہ بنا کر دوسرے شاعروں کی طرح جوہر صاحب نے بھی شعر کہے ہیں۔ یہاں ہم ان کی فکر کی وسعت اور گہرائی کو سمجھنے کے لئے تقابلی جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

سلیم شیرازی نے ''تنہائیوں'' کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ تمہاری وفاداری کی مثال

نہیں مل سکتی۔تم نے ہمکو کہیں اکیلے نہیں جانے دیا یعنی تنہائی کا احساس ہر جگہ رہا چاہے تم تنہائی میں ہوتے ہوئے بھی رونقِ دنیا ہو۔ ہر جگہ تمہارا ہی جلوہ ہے اور ایک ہم ہیں کہ بازار، جہاں بھیڑ ہوتی ہے وہاں بھی خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں لیکن جوہر صاحب نے کیا خوب کہا ہے کہ محبوب کے دیدار کے وقت تو ہنگامہ تھا۔لوگ دیدار کے بعد وہی غم وہی تنہائی، ہنگامہ کے بعد تنہائی کا احساس اور بڑھ جاتا ہے.....

تنہائیو! تمہاری وفا کا نہیں جواب — تم نے کہیں اکیلے نہ جانے دیا مجھے — سلیم شیرازی

ایک تم ہو کہ تنہائی میں بھی رونقِ دنیا — ایک ہم ہیں کہ لگتے ہیں جو تنہا سرِ بازار — سریش چند شوق

ایک ہنگامۂ دیدار کے بعد — پھر وہی غم وہی تنہائی ہے — جوہر

مضطر عظیم آبادی دنیا کو بازار سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں ہر شخص کسی نہ کسی شے کا طلبگار ہے۔کوئی بھی شخص بے طلب نہیں۔ یہ دنیا ایک بازار کی طرح ہے جہاں ہر چیز بیچی اور خریدی جاتی ہے جبکہ صابر ابوہری کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر شخص اپنے مسائل سے دوچار ہے۔۔اسے کسی کے غم میں بھی شریک ہونے کی فرصت نہیں۔ دنیا کی اس حالت پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے لیکن جوہر صاحب کہتے ہیں کہ دل کی دنیا تو ہم لٹا بیٹھے اب ہمارے پاس بچا ہی کیا ہے لیکن لوگ یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ جاں تو سلامت ہے لیکن شاعر کا اصل منشا تو یہ ہے کہ جب دل ہی نہیں تو جان کس کام کی۔اچھا خیال ہے۔

ہر شخص کسی شے کا طلب گار لگے ہے

یارب تری دنیا ہمیں بازار لگے ہے — مضطر عظیم آبادی

یہ دنیا ہے یہاں اے مرنے والے

کسی کو فرصتِ ماتم نہیں ہے — صابر ابوہری

دل کی دنیا تو ہم لٹا بیٹھے

لوگ کہتے ہیں جاں سلامت ہے — جوہر

کمالؔ جعفری اپنے گھر کی بے رونقی کو میر تقی میرؔ سے تعبیر کرتے ہیں۔ میر تقی میرؔ انتہائی مفلس و نادار تھے۔ ان کا گھر کہنے کو تو گھر تھا لیکن نہ دیا ہی روشن ہوتا تھا اور نہ در و دیوار پر ہی کوئی رونق تھی جب کہ رازؔ مناوری اپنی دربدری کا بیان کرتے ہوئے پاؤں کے چھالوں کا ذکر کرتے ہیں۔ گھر ہوتے ہوئے بھی دربدر رہنا حتیٰ کہ پاؤں میں چھالے پڑ جائیں۔ اس سے ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ شاعر کو گھر میں بھی سکون نہیں مل پاتا اسی لئے وہ در بدر کی ٹھوکر کھاتا پھرتا ہے۔ جوہرؔ صاحب کا گھر تو ہے لیکن بیاباں صفت ہے جس کی وجہ سے گھر میں رہتے ہوئے وحشت اور خوف کا احساس حاوی رہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر تنہا اور بے بس ہے اس لئے وہ اپنے گھر کو بیاباں ہونے سے بچا نہیں سکا۔ یہی وجہ ہے کہ بیاباں کو گھر پر ترجیح دے رہا ہے.....

در و دیوار پہ رونق نہ دیا ہی روشن
میرا گھر میر تقی میرؔ کا گھر لگتا ہے — کمالؔ جعفری

اور کیا پاؤں کا چھالا پھوٹ کر کہنے کو تھا
بس یہی میں در بدر تھا اور گھر کہنے کو تھا — رازؔ مناوری

گھر میں رہتے ہوئے ڈر لگتا ہے
اب بیابان ہی گھر لگتا ہے — جوہرؔ

مصطفیٰ جمیل کہتے ہیں کہ ہمارے محبوب کو جدائی کا احساس ہم سے زیادہ ہے اس لئے کہ نظر ملتے ہی میرے ساتھ ساتھ وہ بھی رونے لگا یعنی دونوں کو احساسِ جدائی نے غم و درد کا پیکر بنا دیا ہے کہ اپنے آنسوؤں پر دونوں کا اختیار نہ رہا۔ ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ یہ انتہائے محبت ہے جب کہ شعور نازشؔ کا احساس اتنا شائستہ ہے کہ محبوب کے نظارے کو بھی جرم سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ شریف النفسی کا ثبوت ہے۔ جوہرؔ صاحب کہتے ہیں کہ غمِ شدتِ احساس کی کرم فرمائی کہوں یا تیری یاد کی حوصلہ افزائی کہ میں انسانیت کے جامے میں رہا، مجنوں یا دیوانہ نہیں ہونے دیا۔

نظر ملی تو مرے ساتھ رودئے وہ بھی
انہیں جدائی کا احساس کچھ زیادہ تھا — مصطفیٰ جمیل بالاپوری

احساس کہہ رہا ہے نظارہ بھی جرم ہے
حالات کہہ رہے ہیں سراپا نظر بنو — شعور نازش

کچھ غمِ شدّتِ احساس کی چابکدستی
کچھ تیری یاد نے انسان بنائے رکھا — جوہرؔ

گوپال متّل زندگی کی دعا دینے والے کی سادگی پر ہنس رہے ہیں اس لئے کہ انہیں یہ احساس ہو گیا ہے کہ زندگی کی شمع بجھنے والی ہے یا تو میرے انجام سے بے خبر ہو کر یہ بات کہہ رہے ہیں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے تسلی دینے کی غرض سے ایسا کہہ رہے ہوں۔ شبیّر آصفؔ کہہ رہے ہیں کہ جب میں ڈوبنے لگتا ہوں تو دریا مجھے اچھال دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہماری زندگی کے لئے دعا گو رہتا ہے جس کی وجہ سے زندگی انجام کو نہیں پہنچ پاتی۔ جوہرؔ صاحب پر جان کنی کا عالم ہے لیکن ان کا احساس جاگ رہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اب مرنے کی دعا کی جائے اور اس درد کو دوا سمجھا جائے یعنی موت کا آنا از بس ضروری ہو گیا ہے......

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر — گوپال متّل

نہ جانے کون دعاؤں میں یاد رکھتا ہے
میں ڈوبتا ہوں تو دریا اچھالتا ہے مجھے — شبیّر آصفؔ

جانکنی کا عالم ہے کیوں کھڑے ہیں چارہ گر
موت کی دعا کیجے درد کو دوا کہئے — جوہرؔ

شکیلہؔ بانو بھوپالی نے اس شعر میں دنیا کی بے توجہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

زندگی کو مخاطب کیا ہے کہ زندگی کو اپنے انجام تک پہنچنے کی اس قدر کیوں جلدی ہے۔ دنیا کے حالات تو ایسے ہیں کہ کوئی کسی کے مرجانے پر نہ افسردہ ہوتا ہے اور نہ یہ جاننے کی ضرورت سمجھتا ہے کہ اس شخص کی موت کیوں واقع ہوئی۔ دانش علی گڑھی کو ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ ہماری زندگی کے طلبگاروں کی کمی نہیں جسے دیکھو وہ زندگی کا طالب ہے۔ زندگی کو کہاں چھپایا جائے، کیسے بچایا جائے۔ جوہر صاحب اپنے محبوب کی محبت کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسی سے محبت ہے تو عہدِ وفا کسی دوسرے کے ساتھ۔ یہ تو زندگی کے ساتھ کھیلنے جیسا ہے یہ کام تو یقیناً خطرناک ہے.....

زندگی کو اس قدر جلدی ہے کیوں
کون پوچھے گا اگر مرجائیے — شکیلہ بانو بھوپالی

تاک میں تیری ستمگر ہیں زمانے بھر کے
زندگی جا کے کہاں تجھ کو چھپایا جائے — دانش علی گڑھی

عہدِ وفا کسی سے محبت کسی کے ساتھ
کیوں کھیلتے ہیں آپ مری زندگی کے ساتھ — جوہر

پنّا لال نور اپنے محبوب سے یہ جاننے کے متمنّی ہیں کہ جو غم آپ کی طرف سے مجھے دئے گئے ہیں یہ عارضی تو نہیں۔ اگر تیرے غم عارضی نہیں تو میں انہیں بصد خوشی گلے لگانے کو تیار ہوں۔ فاضل انصاری کہتے ہیں کہ غم ہی ان کی دولت ہے، ان کی میراث ہے۔ غم کے بغیر ان کی زندگی ادھوری لگتی ہے، جب سے غموں کا ساتھ ملا ہے ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ مل گیا ہو۔ جوہر صاحب تو غم کو اپنا دیرینہ رفیق سمجھتے ہوئے اس سے بے تکلفی سی محسوس کرتے ہیں گویا غم ہی ان کا ہمدم ہے، ساتھی ہے، دوست ہے۔ یہ ایک ایسی علامت ہے کہ شاعر کا اب نہ تو پرسانِ حال ہے نہ ہمدرد، اسے لئے اسے غم کو اپنا عزیز، اپنا دوست اور ساتھی سمجھنے پر مجبور ہونا پڑا.....

میں مطمئن ہوں مگر صرف یہ بتا دیجئے
یہ غم جو آپ نے بخشا ہے عارضی تو نہیں — پنّا لال نور

دل کے مکاں میں آنکھ کے آنگن میں کچھ نہ تھا
جب غم نہ تھا حیات کے دامن میں کچھ نہ تھا فاضل انصاری

غم پرانا رفیق ہے اپنا
اس سے کچھ بے تکلفی سی ہے جوہر

''ترانۂ بیداری'' سے کچھ پسندیدہ اشعار ضیافت طبع کے لئے پیش کرتا چلوں۔ ان اشعار میں جوہر صاحب کی فکر بلندی پر ہے۔ جوہر صاحب کے پیشتر اشعار اظہارِ عشق و محبت کے تعلق سے ہیں۔ ان کی یہ خواہش ہے کہ دنیا میں اگر کوئی مذہب عشق و محبت ہو، رواداری ہو، ایک ہی سول کوڈ ہو، لوگ مذہب کے نام پر خون خرابہ نہ کریں، آپس میں مل جل کر رہیں۔ جوہر صاحب کی پوری شاعری ایک جذبہ کے تحت ہے، ایک مقصد کے تحت ہے۔

ہے ذرّہ ذرّہ شوقِ سماعت سے بیقرار تم گنگنا رہے ہو کسی آبشار میں
ہاتھ اٹھتے نہیں دعا کے لئے یہ خودی ہے کہ بے خودی سی ہے
عمر کیا دھار پہ بہتی ہوئی ایک ناؤ سی ہے زندگی ریت کی دیوار نظر آتی ہے
کاش کوئی ہو مونس و رساز غم اکیلے سہا نہیں جاتا

OO

Akhtar Shahjhanpuri
Rangeen Chaupal, Shahjahanpur-242001
Phone : 05842-222909, 220547

بی ایس جین جوہرؔ کی شاعرانہ خصوصیات

کسی صاحبِ نظر کا قول ہے..... ''قدرِ گوہر شاہ داند یا بہ داند جوہری''..... اس مقولے سے یہ تو ثابت ہو ہی گیا کہ گوہر کی قدر شاہ یا جوہری جانتا اور سمجھتا ہے۔ مگر آدمیت کی اس بھیڑ میں کسی جوہری کو تلاش کرنا، پھر اس کے جوہر کی قدر و منزلت دشوار طلب منزل ضرور ہے مگر پروفیسر خالد حسین خاں جیسی بالغ النظر شخصیت، ممتاز ناقد، محقق ادیب اور مبصر کے لئے کچھ مشکل کام نہ تھا۔ انہوں نے جوہر کو تلاش بھی کیا اور جوہری کے سامنے ہیرے جواہرات کے انبار بھی لگا دئے۔

دنیائے شعر و سخن میں جوہرؔ تخلص کے بہت سے افراد گذر گئے اور آج بھی موجود ہیں جن میں سب سے نمایاں نام مولانا محمد علی جوہرؔ کا ہے جو ہمارے ملک کی آن بان اور شان، کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ وطنِ عزیز کے لئے ان کی عظیم قربانیاں اور پاکیزہ جذبۂ حب الوطنی کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ جوہرؔ، مجاہدِ آزادی اور عظیم شاعر تھے۔

دوسرے جناب جوہرؔ بدایونی، مستند عالم، بلند پایہ شاعر اور تیسرے چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری تھے جن کا ایک شعر آج بھی حافظے میں موجود ہے.....

وقت کے ساتھ ساتھ چل، وقت کا اعتبار کر
جس سے ملے حیاتِ نو، راہ وہ اختیار کر

چوتھا نام جناب بی ایس جین جوہرؔ کا ہے جن کا مجموعۂ کلام ''ترانۂ بیداری'' مطالعہ کی میز پر ہے۔

دراصل آدمی کے کردار میں ناموں کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس لئے بزرگوں کا

فرمان ہے کہ اپنا نام بہتر سے بہتر رکھوتا کہ اس نام کے اوصاف و کمال بھی اندر آ جائیں۔ تو جناب جوہرؔ نے اپنا تخلص جوہرؔ رکھ کر یقیناً اپنے اندر جواہرات کی ایک دنیا بسالی ہے۔

جناب جوہرؔ ایک صاحبِ علم شخصیت ہیں اور شعر و ادب انکا فطری ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ شاعری کسب نہیں بلکہ عطیۂ خداوندی ہے.....

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ کیوں نہ خوبیٔ قسمت پہ اپنی ناز کرے

ہمارا مشاہدہ بھی یہی ہے کہ دنیائے شعر و ادب میں ایسے ممتاز صاحبِ کمال بھی نظر آتے ہیں جن کی اکیڈمک کوئی حیثیت نہیں مگر ان کی کمال کی شاعری آج بھی قلب و نظر کی تسکین کا سامان بنی ہوئی ہے اور ان میں بعض بعض تو ایسے ہیں جن کے اشعار مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں اور زباں زدِ خاص و عام ہیں۔

جناب جوہرؔ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور اپنے گرد و پیش سے مکمل طور سے باخبر ہیں۔ ایک کاروباری شخصیت اور ذمہ دار فرد کی حیثیت سے انہوں نے شعر و ادب کے ذوق کو تابندہ رکھا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ذوقِ شعری، فطری ذوق تھا جس نے ہر حال میں جینے اور تر و تازہ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

انسان کی فطرت میں دولت، اولاد، وطن اور اپنی جان کی محبت شامل ہے۔ اسی فطری تقاضے کے مطابق انہوں نے جہاں دولت و ثروت کی جستجو، اولاد کی شاندار تربیت، اپنی جان کی حفاظت کا فرض ادا کیا ہے وہیں وطن کی فطری محبتوں کا اپنی شاعری میں اظہار کر کے اور مختلف انداز سے گل بوٹے سمو کر شعر و ادب کے حوالے سے پیش کیا ہے ساتھ ہی درس و تبلیغ کا بھی اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ حالات انسان کو کسی بھی مقام پر لے جائیں مگر اپنے وطن، پیاری سرزمین مین رچی بسی خوشبو اس کا ہر مقام پر طواف کیا کرتی ہے۔ ہر مذہب و ملت میں وطن سے محبت، وطن سے پیار، وطن سے وفاداری کے پاٹھ پڑھائے گئے ہیں اور پڑھائے جاتے رہیں گے۔ اقبالؔ کا یہ شعر اسی

محبت کا آئینہ دار ہے......

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

یہ اقبال نہیں بلکہ اقبالی فطرت کا اظہار ہے۔اپنے وطن ہندوستان کو صدیوں کی غلامی سے آزادی دلانے کا جذبۂ صادق کا اظہار جناب جوہؔر بھی کرتے ہیں......

دنیا کی بیدار فضا ہے　　　　چاروں طرف کہرام مچا ہے
لاشوں کے انبار پڑے ہیں　　　　دولت کا دل کانپ رہا ہے
لیکن تم ہو محوِ غلامی

اوراس طرح قوم کے ضمیر کو جھنجوڑتے ہیں اورایک جوش وولولہ کی فضا تشکیل کرتے ہیں......

آؤ اے ارجن کی اولادو　　　　قصرِ وطن کی اے بنیادو
طوفانوں سے لڑنا سیکھو　　　　دولت کی تعمیر گرادو
تم پر ہیں دنیا کی نگاہیں

ایسے جذبۂ حب الوطنی اورایسی شاعری کی داد وہنر، جوہؔر کا امتیازی حصہ ہے جس کے وہ بجاطور پر مستحق ہیں۔مذہب کے عنوان سے جناب جوہؔر کی نظم کا آخری بند ان کی تہذیبی وراثتی شرافت کا آئینہ بھی ہے اور عقیدت کا خراج بھی جس کی ستائش ہر بھارتی پر لازم ہے......

مذہب نہ سہی، ہر مذہب کا کردار تو پیدا کر ہی دیا
بھیری ہوئی باغی فوجوں کا سالار تو پیدا کرہی دیا
اس دورِ غلامی میں جوہؔر اس کا رگھہِ دنیا میں مگر
فطرت نے اہنسا کا آخر اوتار تو پیدا کر ہی دیا

نظموں کے روایتی مزاج سے ہٹ کر جناب جوہؔر نے نظم میں بھی خوبصورت شاعری کی ہے۔ایک نظم کا یہ شعر قابلِ تحسین ہے......

کلی کلی کھل رہی ہے دل کی، غضب کا ہے بانکپن ہوا میں
گلوں میں ہے بھینی بھینی خوشبو، تمام غنچے مہک رہے ہیں

بعنوان ''درسِ آدمیت''، نظم کا یہ بند بھی شاعری کے تمام تر لوازم کے ساتھ سماعت میں رس گھول رہا ہے.....

اٹھ گئے جام و سبو اب وہ مزہ کچھ نہ رہا
گلشنِ زیست میں اب لطف ہی کیا کچھ نہ رہا
غربت و پستی و ذلت کے سوا کچھ نہ رہا
ہوگیا جذبۂ بیدار فنا، کچھ نہ رہا
صبح کاشی کی ہوئی ہے شبِ ہجراں سے اداس
ہوگئی شامِ اودھ، شامِ غریباں سے اداس

جناب جوہر کے مجموعۂ کلام میں نظموں کے بعد غزلیات بھی شامل ہیں۔ ''ترانۂ بیداری'' میں قومی یکجہتی کا جو منظر نامہ اردو و ہندی دونوں زبانوں کے رسم الخط کا اشتراک و امتزاج، ایک حسین و دل کش امتزاج ہے جو جوہر کی نظرِ بلیغ، اخلاص و وفاداری کا مرقع کہا جائے گا۔ ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کا جو عملی کارنامہ اپنے مجموعۂ کلام کی طباعت کی شکل میں جناب جوہر نے انجام دیا ہے وہ لائقِ توصیف ہے۔ غزلیں بھی اپنا ایک بانکپن اور دماغِ شگفتگی رکھتی ہیں۔ افسوس کہ وقت کی کمی اور شدید مصروفیات کے پیشِ نظر اشعار کے تجزیہ سے خود کو مجبور پاتا ہوں ورنہ جناب جوہر کی شاعری غور و فکر کی دعوت ہی نہیں بلکہ تفصیلی تعارف و پذیرائی کی حقدار ہے بالخصوص جوہر کے درج ذیل اشعار سے مشتِ از خروارے آپ بھی محظوظ ہوں.....

ترا حسن کافرانہ مرا عشق والہانہ
نہ تجھے خبر تھی اپنی نہ مرا کوئی ٹھکانہ
کبھی مائلِ تکلّم کبھی دل میں ہے تلاطم

اردو کی قابلیت رکھتے تھے، شعر و شاعری کا بھی تھوڑا بہت شوق تھا وہ مجھے شاید ورثے میں ملا ہے۔

آپ نے بہت اچھا کیا تھا کہ اپنے والد کی ہدایت پر اردو شاعری سے توجہ کم کر کے تجارت میں مصروف ہو گئے اور جب آپ کے صاحب زادے تپن کمار جین کاروبار سنبھالنے کے قابل ہو گئے تو آپ نے پھر شاعری شروع کر دی۔ اس دوسرے دور کی شاعری میں چالیس پچاس سال کی زندگی کے تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ شامل ہے اور اسی لئے آپ کی شاعری میں فکر و بصیرت، تجربے اور مشاہدے میں پختگی اور گہرائی ہے۔ آپ کو نظم، غزل، قطعات اور دوہوں پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ میں نے یہ شعر بہت پہلے سنا تھا اور اپنی ایک دو تقریروں میں بھی دہرایا تھا۔ شعر ہے:

کس سے پوچھا جائے جنت کا پتہ
اہلِ مذہب کو نہیں کچھ بھی خبر

اب معلوم ہوا کہ یہ شعر آپ کا ہے۔ آپ کی کئی نظموں کا شمار اردو کی بہت اچھی نظموں میں ہوگا۔ "ترانۂ بیداری" کے دوران مجھے آپ کی بعض نظمیں مثلاً "ترانۂ بیداری"، "مذہب"، "اوشا"، "فطرت کا پجاری"، "نجمہ سے"۔ "آؤ تو سہی"، "برہہ کا گیت" وغیرہ بہت پسند آئیں۔ یہ رومانی نظمیں اختر شیرانی کی نظموں کی ہم پلّہ ہیں۔ بہر حال میری دعا ہے کہ خدا آپ کو ہمیشہ تندرست، سلامت و خوش و خرم رکھے۔ آپ کا ظاہر و باطن ایک ہے اور آپ ہندو مسلم کلچر کی مشترکہ آبرو ہیں۔ اس ذیل میں، میں ڈاکٹر خالد حسین کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے آپ جیسے جوہرِ یگانہ سے نہ صرف روشناس کیا بلکہ تفصیلی گفتگو کا موقع بھی فراہم کیا۔ خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔

نیاز کش

ڈاکٹر خلیق انجم

جنرل سکریٹری: انجمن ترقی اردو (ہند)

"اردو گھر"، اردو مارگ، ۲۱۲، روز ایونیو، نئی دہلی

Mobile : 09891160156

کبھی بولنے کی کوشش کبھی بول بھی نہ پانا

تلاش کرتا ہوں دوسروں کی خوشی مین تکمیل حسرتوں کی
میں اپنی خوں گشتہ آرزوؤں کے لالہ زاروں کو ڈھونڈتا ہوں

ساون کی رت، بہار کا موسم، اندھیری رات
رم جھم کے گیت گونج رہے ہیں پھوار میں

اگر آدمی کچھ سمجھدار ہوتا تو دنیا میں بس پیار ہی پیار ہوتا

غم پرانا رفیق ہے اپنا اس سے کچھ بے تکلفی سی ہے

غم نہیں ہے تو پھر خوشی کیا ہے؟ غم میں خوشیوں کی چاشنی سی ہے

بڑھ گئی رونقِ در و دیوار جب سے گھر میں نقوشِ آب کھلے

دل کی دنیا تو ہم لٹا بیٹھے لوگ کہتے ہیں جاں سلامت ہے

اس طرح کے بہت سے اشعار، مجموعۂ کلام میں موجود ہیں جو جنابِ جوہر کے قادر الکلام شاعر ہونے اوران کی سیرت واعلیٰ کردار کی غمازی کرتے ہیں ساتھ ہی شاندار مستقبل کی چغلی کھارہے ہیں۔

OO

Maulana Syed Qamar Shahjahanpuri
Karnail Ganj, Kanpur
Mobile : 09935387929

ترانۂ بیداری : ایک تاثر

جناب بی ایس جین جوہرؔ کا مجموعۂ کلام ''ترانۂ بیداری'' حقیقتاً ایک شعری اور تہذیبی تحفہ ہے۔ جوہرؔ صاحب کے اس مجموعۂ کلام میں ایک نہیں کئی باتیں جاذبِ توجہ ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ نرے شاعر ہی نہیں زبان کے جوہر شناس بھی ہیں۔ صرف یہی نہیں وہ زبان کی نزاکتوں اور لطافتوں کا شعور بھی رکھتے ہیں بلکہ اپنے شاعرانہ عمل سے وہ قاری اور سامع کو بھی زبان کی نزاکتوں اور لطافتوں سے پوری طرح محظوظ کرتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ نہایت بالیدہ، تہذیبی شعور اور زندگی کے تہذیبی برتاؤ سے بھی اپنے سامع یا قاری کو اس درجہ لطافت کے ساتھ آشنا کرتے ہیں کہ انہیں کوئی شاعر کے مرتبے سے ہٹا کر معلمِ اخلاق یا واعظ کی صف میں لاکر بٹھانے کی جسارت بھی نہیں کرسکتا۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ ان کی شاعری ہو یا شخصیت بے تکلف، بے ریا، سچے اور مخلص انسان کے وجود کی خبر رساں ہے۔ یہ بھی بڑی بات ہے کہ جوہرؔ صاحب مذہب کی عظمت اور مذہبی اقدار کی اہمیت کے بھی قائل ہیں۔ وہ ہر اچھے انسان اور بیشتر شعراء کی طرح انسانی اقدار کے قصیدہ خواں اور اس کی شکست وریخت کے مرثیہ نگار بھی ہیں۔ انہوں نے اگر کہیں پر مذہب سے بیزاری کا اظہار بھی کیا ہے تو وہ مذہب وہ مذہب کے نام پر ہونے والی غیر مذہبی رسومات ورسمیات اور انسانیت سوز خرافات کی بنا پر۔ ان کے ذیل کے اشعار اور مصرعے جو میں نے مختلف غزلوں اور نظموں سے محض مختصر سے مطالعے کے بعد انتخاب کر لئے ہیں، میرے ان تمام معروضات کے شاہد ہیں.....

کچھ غم و شدتِ احساس کی چابک دستی
کچھ تری یاد نے ''انسان'' بنائے رکھا
عبث ہے دل شکستہ ہو کے اپنی جان کھو دینا
وفا سے آشنا اور ''آج کا انسان!'' رہنے دو
مذہب کی روایات سے قائم رہا ''انساں''
قانون نہ کرپائے گا دنیا کی حفاظت
دو پیار کے الفاظ کہ دو رحم کے آنسو
جو جس سے بھی مل جائے وہی اس کی عنایت

مذہب کے ترانے کیا چھیڑوں، مذہب کے زمانے بیت گئے
جاگ اٹھو اے دنیا والو سب کچھ پاکر کھونے والو
خلوت کی تاریک فضا میں اشکوں سے منھ دھونے والو
تم نے اپنی قدر نہ جانی

جوہر صاحب نے جس صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے اس کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور اکثر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کی بعض نظمیں ہیئت اور مواد دونوں سے نظم میں ان کے اختیار کردہ اسلوب اور معیار پر بالکل پوری اترتی ہیں۔ اس طرح ان کی متعدد غزلیں نہایت عمدہ اور تحفہ غزلیں، ان کے قطعات اور دوہے یقیناً قابلِ داد ہیں۔ انہوں نے بعض قطعات میں بعض مذہبی تصورات کو اپنی شاعرانہ ظرافت کے ساتھ بالکل اچھوتا رخ دے دیا ہے۔ مثلاً ''توحید'' کے فطری اور آفاقی تصور کو انہوں نے جس طرح پیش کیا ہے وہ انہیں کا حصّہ ہے.....

اگر خدا ایک ہی نہ ہوتا
تو آدمی یوں نہ جان کھوتا

لڑا کے دونوں خداؤں کو ہی
خود اپنے گھر میں مزے سے سوتا

''ترانۂ بیداری'' جس انداز سے اور جس اہتمام سے شائع کی گئی ہے وہ بھی قابلِ داد ہے۔ اردو شاعری کے ایسے مجموعہ کو یقیناً اسی انداز سے شائع ہونا چاہئے۔ بی ایس جین جوہرؔ صاحب اور ان کا مجموعۂ کلام، دونوں ہی ہماری اس ادبی اور تہذیبی روایات کی قابلِ تحسین اور لائقِ ستائش امانتیں ہیں جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جس پر دنیا بھر کی ادبی اور تہذیبی روایتوں کے سامنے بجا طور پر ناز کرتے ہیں۔

بطورِ خاص، میں محترم خالد حسین خاں کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں مجھے جوہرؔ صاحب کی شعری تخلیق ''ترانۂ بیداری'' عنایت کی اور مجھ سے اس پر اظہارِ خیال کی فرمائش بھی کی، میں نے اپنی مصروفیات کے سبب مختصر خیالات پیش کر دیے ہیں۔

○○

Syed Aqeel-ul-Gharavi
Safinat-ul-Hidayat Trust, Delhi

بی ایس جین جوہرؔ کی شاعری: ایک جائزہ

بی ایس جین جوہرؔ صاحب کا مجموعہ کلام ''ترانۂ بیداری'' میرے سامنے ہے۔ میں نے بغور اس کا مطالعہ کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف ایک پر گو، سنجیدہ اور معتدل مزاج شاعر ہیں نیز غزل و نظم کی صنفِ سخن کے رموز و اظہار و بیان سے انہیں گہری واقفیت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان کی سادگی، جذبات کی پاکیزگی اور خیالات کی سنجیدگی بھی ان کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

اہلِ علم و ادب اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ غزل ابتداء ہی سے عشق، شراب و شباب اور ہجر و وصال جیسے عنوانات و جذبات کے گرد چکر لگاتی رہی ہے۔ اسی لئے اس کو نیم وحشی صنف بھی کہا گیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر دور میں ایسے لوگ بھی موجود رہے جنہوں نے اس کا رخ غمِ جاناں سے ہٹا کر غمِ جہاں کی طرف موڑا ہے اور اس میں دلکشی اور رعنائی کے ساتھ صحت مندی و تعمیری اقدار کو شانہ بہ شانہ جگہ دی ہے، اسی قافلے کے مردِ میدان جناب بی ایس جین جوہرؔ بھی ہیں جنہوں نے ایسے وقت میں جب کہ تعمیری و اخلاقی قدریں مسمار ہوتی ہوتی جارہی ہیں اور بنی نوع انسان نے خود غرضی، مفاد پرستی اور کدورت کو اپنا شیوہ بنالیا ہے وہ خلوص نیت کے ساتھ اخلاقی و انسانی اقدار کی بازیابی کی سعی کر رہے ہیں جو موصوف کے ایک ایک شعر سے عیاں ہے۔ آپ بھی چند اشعار دیکھئے.....

اگر آدمی کچھ سمجھدار ہوتا
تو دنیا میں بس پیار ہی پیار ہوتا
محبت سکھانے پیمبر نہ آتے
ہر اک شخص دھرتی پہ اوتار ہوتا
دردِ دل ہم کسی سے کہہ نہ سکے
آہ تو منھ سے بارہا نکلی!
مجھے دیکھ کر کسی کا سرِ راہ مسکرانا
یہی بات تھی ذرا سی یوں ہی بن گئی فسانہ

ان اشعار کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے غزل کو رسمی عشق و عاشقی کے مفروضہ مضامین اور فرسودہ موضوعات سے بلند کر کے حقیقی معاملات اور واقعات کی ترجمانی کا ذریعہ بنایا ہے یہی ان کی شاعری کے صحت مند ہونے کی علامت ہے۔

آج کے دور میں مذہبی تفرقہ اندازی اور فرقہ پرستی کے سبب دلوں میں جو نفرت بیٹھی جارہی ہے اس کے اثرات کی طرف موصوف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ۔

قتل و غارت ہے گلی کوچوں میں
شہر دہشت کا نگر لگتا ہے
غیر تو غیر ہمیں آج کے دن
اپنے ہمسائے سے ڈر لگتا ہے

ایک دردمند دل رکھنے والا شاعر جس کو بنی نوع انسان سے ذرا سا بھی پیار ہو تو وہ معاشرے کی ان خرابیوں پر کڑھتا ہے اور آس پاس کے منظر کو دیکھ کر بقول جوہر صاحب ہمسایہ سے بھی ڈرنے لگتا ہے۔

جوہر صاحب صالح مبشت فکر کے شاعر ہیں۔ وہ زندگی میں راست روی، خیر و فلاح اور تعمیری و ترقی کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان، انسان بن کر زندگی گزارے اور معاشرہ جو آج انحطاط کی طرف تیزی سے پیش قدمی کر رہا ہے وہ حسن و اخلاق کے اوصاف کی

طرف مائل ہو مگر ذرا سمجھ داری کی ضرورت ہے کیوں کہ بقول جوہر صاحب ؎

اگر آدمی کچھ سمجھدار ہوتا

تو دنیا میں بس پیار ہی پیار ہوتا

شعر حقیقت میں شاعر کی ذہنی و دلی کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا شعر سے ظاہر ہے کہ جوہر صاحب کا دل محبت بنی نوع انسان سے لبریز ہے۔ ان کے یہاں جو غم ہے وہ صرف اپنا نہیں ہے بلکہ ماحول کی تباہی کا کرب ان کی غزلوں میں سما گیا ہے اور دو ہے کہنے پر مجبور ہوئے ؎

نعمتیں ساری ہیں دنیا میں میسّر لیکن

سر پہ لٹکی ہوئی تلوار نظر آتی ہے

عمر کیا دھار پہ بہتی ہوئی اک ناؤ سی ہے

زندگی ریت کی دیوار نظر آتی ہے

جین صاحب نے زندگی کی سچی تصویر مندرجہ بالا اشعار میں کھینچ کر رکھ دی ہے۔ موصوف کے سوچنے کا یہ انداز کا شعر کہنے کا ڈھنگ انہیں اپنے پیشتر ہم عصر شعراء سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ سلیقہ مندی اور اثر انگیزی میں بھی سب سے جدا ہے۔ وہ اپنی ایک نظم ''درسِ آدمیت'' میں کھل کر کہتے ہیں ؎

میرے سینے میں لرزتا ہے وہ ایمان کا نور

جس سے تاریکیاں رہتی ہیں سدا دور ہی دور

تجھ کو مذہب میں رہے عقل و عقیدت کا شعور

یاد رکھ، بھول نہ انسان کہ مرنا ہے ضرور

اے پرندے کبھی پرواز کی طاقت پہ نہ پھول

سیر کر خوب مگر اپنے نشیمن کو نہ بھول

اس بند کی فکر کی گہرائی، جذبہ کی پاکیزگی، صالح روایتوں کی پاسداری صاف نمایاں ہے ایسی سچائی اور اس حسن کے ساتھ اگر کوئی فنکار تخلیق ادب کرے تو آج کے ماحول میں اس کو شعور کی بلندی اور صالح نظریات کی نمائندگی کے سوا کیا کہا جائے۔

آج کے نیتاؤں کی سیاسی بازی گری کو کون نہیں جانتا؟ جین جوہر صاحب ان کے منافقانہ رویہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک قطعہ میں فرماتے ہیں۔

مذہب کی ترازو میں وطن بانٹ رہے ہیں
میدانِ سیاست میں لہو چاٹ رہے ہیں
یہ دیش کے نیتا تو ہیں خود اپنے ہی دشمن
جس شاخ پہ بیٹھے ہیں اسے کاٹ رہے ہیں

جب حالات ایسے ناگفتہ ہو جائیں اخلاقی اقدار روبہ زوال ہوں اور بے راہ روی عام ہو جائے تو نسلِ انسان لازمی حادثوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسی پس منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

رہزنوں کا ہے راج سڑکوں پر
لٹتی ہے گھر کی لاج سڑکوں پر
نسلِ انساں ہے حادثوں کی شکار
خون بہتا ہے آج سڑکوں پر

معاشرے کے بگاڑ میں کچھ عام لوگ ہی شریک نہیں بلکہ اس تیز آندھی کی زد میں بڑے سے بڑے لوگ بھی پستی کی حد تک پہنچ گئے ہیں جس کی وجہ سے سادہ دل لوگ حیران ہیں کہ اب.....

کس سے پوچھا جائے جنت کا پتہ
اہلِ مذہب کو نہیں کچھ بھی خبر

سچ پوچھئے تو احساس کی سچائی اور اظہار کی صفائی نے موصوف کے اشعار کو نہ صرف تاثیر عطا کی ہے بلکہ اس طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ جوہر صاحب

اچھے انسان ہیں اور ان کا شعور شاعری حقیقت پسند اور صحت مند ہے جذبات کی پاکیزگی اور خیالات کی سنجیدگی کے ساتھ ساتھ وہ سماج کو پیار و محبت، دین و اخلاق کا سبق پڑھانا چاہتے ہیں چنانچہ اپنی پہلی نظم ''ترانۂ بیداری'' میں قوم و وطن کے سوتے ہوئے نوجوانوں للکارتے ہوئے کہتے ہیں ۔

جاگ اٹھو اے سونے والو　　سب کچھ پاکر کھونے والو
خلوت کی تاریک فضا میں　　اشکوں سے منھ دھونے والو
تم نے اپنی قدر نہ جانی

مگر ابھی وقت ہے اس لئے ۔

آؤ اے ارجن کی اولادو!　　قصرِ وطن کی اے بنیادو
طوفانوں سے لڑنا سیکھو　　دولت کی تعمیر گرادو
تم پر ہیں دنیا کی نگاہیں

ان اشعار کی رمزیت کسی تشریح کی محتاج نہیں ان کے پیچھے شاعر کی جو گہری آرزو مندی پوشیدہ ہے جو نوجوانانِ وطن کو عمل اور حرارت کا پیکر دیکھنا چاہتا ہے۔ انقلاب یا تبدیلی کی یہ شعوری خواہش جس نے اپنی آنکھوں سے افلاس کے مارے ہوئے انسان کو دیکھا ہے جس کی زبانِ قلم کو درسِ آدمیت کے سلسلے میں یہ کہنا پڑا ۔

جنگ کے سائے میں کس طرح سے رہتے ہیں غریب
کچھ فسانے غم و آلام کے کہتے ہیں غریب
کیسے کیسے وہ مصائب ہیں جو سہتے ہیں غریب
ہائے افلاس کے سیلاب میں بہتے ہیں غریب
ان کی حالت تو ذرا دیکھ کہ ہے باعثِ ننگ
سیکڑوں آدمی پھرتے ہیں یہاں ننگ و دھڑنگ

اس بند کی پوری نظم میں شاعر نے جن احساسات اور حقیقی حالات کو شعری قالب میں

ڈھالا ہے وہ عام خیال ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے جس کو پڑھ کر قاری تو متاثر ہوتا ہی ہے خود اس سے شاعر کی دردمندی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ کچھ عرصہ سے ہندوستان کو فرقہ وارانہ فسادات نے اپنے سایہ میں لے رکھا ہے جس کے نتیجہ میں ہر چہار طرف ایک عجیب وغریب، ہیجان برپا ہے حالانکہ بے گناہ لوگوں کا اس طرح مارا جانا معصوم افراد کا کشت وخون بہانا محض اس بات پر کہ یہ ہندو ہے، یہ مسلمان ہے، اخلاقی قدروں کے منافی ہے جس کو ملک کا سنجیدہ طبقہ ذرا بھی پسند نہیں کرتا ایسے ہی لوگوں میں جناب جوہر صاحب کا بھی شمار ہے چنانچہ بیچارے آنسو بہاتے ہوئے رقم طراز ہیں.....

جنگ و جدل کے شعلے ہر سو، اک موجِ طوفانی
امن و محبت کے ساگر میں آئی ہے طغیانی
کھیل رہی ہے خاک و خون سے پھر نسلِ انسانی
اپنے فرض سے غافل ہونا ہے تیری نادانی

اے شاعر، اے حسن کے شیدا، اے فطرت کے پجاری

ہندوستان جو ہمیشہ سے جنت نشان کہلاتا ہے، جس نے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور پارسی ہر قوم کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دی ہے وہاں کشت وخون کا بازار گرم ہوا۔ جنگ و جدل کے شعلے بلند ہوئے، نسلِ انسانی اپنے فرض سے غافل ہو کر ایسا شیطانی کام کریں، اے فطرت کے پجاری، سوچ یہ کتنی بڑی بات ہے۔

نظم کے اس بند سے محسوس ہوتا ہے کہ جین صاحب اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے ہیں، وہ نہیں چاہتے کہ اس طرح بے گناہ مارے جائیں۔ اس طرح خونریزی ہوتی رہے اور ہندوستان کے ماتھے پر ظلم و بربریت کا داغ لگتا رہتا ہے۔ کتنی افسوسناک بات ہے۔ اس جیسی نظمیں نہ صرف اس دعویٰ کو تصدیق کرتی ہیں بلکہ اس کی شہادت دیتی ہیں کہ جناب جین جوہر صاحب محبت بھرا دل و دماغ رکھتے ہیں اسی لئے فرقہ پرستی کے سبب دلوں پر جو نفرت کے گہرے

○ رئیس صدیقی

مکرمی خالد حسین صاحب آداب!

یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ عظیم اور نامور شاعر، عالی مقام حضرت سیماب اکبر آبادی کے شاگردوں کی آخری نشانی جناب بی ایس جین جوہر میرٹھی کے ''فن اور شخصیت'' پر ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں۔

ایسے موقع پر جب ایک مخصوص گروہ نے اردو کو ایک خاص مذہب اور فرقہ سے جبراً وابستہ کر دیا ہے، جناب بی ایس جین جوہر میرٹھی کا ''اردو زبان و ادب کے تئیں بے پناہ لگاؤ'' ہم سب کے لئے باعثِ اطمینان اور راحت ہے اور ہمارے لئے لازمی ہے کہ ہم جوہر جیسے اردو کے شیدائیوں اور پرستاروں کی دل کھول کر ہمت افزائی کریں اور انہیں کتابی شکل میں ہمیشہ کے لئے امر کر دیں۔

آپ دونوں اردو کی بے لوث خدمت کے لئے ستائش اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

خادمِ اردو

رئیس صدیقی
پروگرام ایکزیکیٹو اردو مجلس، آل انڈیا ریڈیو،
نئی دہلی
Mobile : 09810141528

اثرات بیٹھے جا رہے ہیں جس کو دیکھ کر جوہر صاحب کا دل کڑھتا ہے اور وہ انہیں اظہار و بیان کے لئے آمادہ کرتا ہے اور موصوف کی زبان سے کہلواتا ہے ۔

چھیڑ وہ نغمہ جو شعلوں پر برسے بن کر شبنم
پیار و محبت کی لے میں ہو سات سروں کی سرگم
ایسا کچھ لکھ جس سے بدلے کہنہ نظمِ عالم
اور رواداری پر آخر ہو یہ دنیا قائم

اے شاعر، اے حسن کے شیدا، اے فطرت کے پجاری

وہ شاعر سے صرف شعر ہی نہیں کہلوانا چاہتے بلکہ دیش کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے شبنم کی طرح برسنا چاہتے ہیں تا کہ آپسی منافرت کے شعلے بجھ سکیں۔

بہر حال مختصر یہ ہے کہ جوہر صاحب کا نقطۂ نظر تعمیری ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ زندگی کی راہ میں پیار و محبت کی شمع جلائی جائے تا کہ اس کی روشنی میں انسانوں کے درمیان دردمندی کا رشتہ مضبوط ہو۔ اسی لئے سچی شاعری ہے اور یہی اس کا حسن ہے اور یہی ان کی دعا ہے ۔

نہ کسی کے من میں گلا رہے
نہ ہی کوئی مجھ سے خفا رہے
میں کسی کے کام تو آسکوں
یہی میرے لب پہ دعا رہے

OO

Mateen Tariq Baghpati
Talimi Markaz, Sabzi Mandi, Baghpat

جوہر صاحب ......ایک تاثر

میں جب امریکہ سے آئی تو رفعت صاحب نے اپنے دولت کدہ پر میرے اعزاز میں ایک شام منعقد کی وہاں جوہر صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ رفعت صاحب نے میرا تعارف کرایا اور میں نے ان کو دیکھا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں ان کو جانتی ہوں۔ شکل کچھ جانی پہچانی سی محسوس ہوئی لیکن یاد نہیں آ رہا تھا۔ گھر آ کر بھی ذہن پر بہت زور ڈالا لیکن یاد نہیں آیا، دوسری بار دیکھنے پر بھی یاد نہیں آیا۔

آج جب ان کی کتاب آئی اور تصویر دیکھی تو بالکل یاد آ گئے۔ آگرہ میں میرے والد کے ایک دوست بہاری لال، جو کہ انڈسٹرلسٹ تھے اور ابا جان کی ان سے بہت دوستی تھی، گھر کی طرح ہی آتے جاتے تھے۔ میں تو بہت ان کے گھر جاتی تھی، ہر تہوار پر ان کی بیوی ہم لوگوں کو بلاتی تھیں۔ میں ان کو چچا جان کہتی تھی۔ ان کے یہاں کے پکوان بہت ہی اچھے ہوتے تھے، ہم لوگ نہ صرف کھاتے بلکہ وہ ہمارے ساتھ بھی کر دیتی تھیں۔ وہ بہت اچھے تھے، بڑی محبت کرنے والے انسان تھے۔ بی ایس جین جوہر کی تصویر بالکل ان کی شکل سے مشابہ ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شکل اور صورتیں ایک جیسی ہو جاتی ہیں، وہی چہرے پر معصومیت، وہی مسکراہٹ، یہ ایک ذاتی سی بات ہوگئی۔ جوہر صاحب کے فن کے بارے میں میں سوچتی ہوں کہ کیا لکھوں؟

یوں تو جوہر صاحب کا آبائی پیشہ تجارت ہے لیکن انہوں نے تجارت کے ساتھ شاعری کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے رکھا۔ ایک طرف تجارت کی ذمہ داریاں تو دوسری طرف شاعری کی

نرم گداہٹ ان کے گلے کا ہار بن گئی اور اس کے موتی، مالا کی شکل اختیار کر گئے۔ انہوں نے ہر صنف میں شعر کہے، غزلیں، نظمیں اور دوہے لکھے اور آج وہی موتی ہیرا بن گئے۔

سب سے بڑی خوبی جوہر صاحب میں یہ ہے کہ وہ صرف ایک انسان ہیں۔ ان کے یہاں دھرم یا مذہب کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ ان کی نظر میں ہر انسان برابر ہے جس طرح منشی پریم چند نے غریب مزدوروں کے لئے لکھا اور امر ہو گئے۔ جوہر صاحب کو بھی ستائش یا صلہ کی پرواہ نہیں ہے۔ کچھ لوگ شاعری کرتے ہیں اور اسے روزی روٹی بنا لیتے ہیں لیکن جوہر صاحب اپنے ذہنی سکون اور فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر شعر کہتے ہیں۔ ان کے یہاں طلب ہے جیسے کوئی معصوم بچہ اپنی ماں سے کھلونوں کی ضد کر کے مچل جائے۔ ان کے یہاں بھی وہی معصوم جذبہ نظر آتا ہے اور انہیں اپنا بچپن یاد آنے لگتا ہے اور وہ کہتے ہیں.....

ہائے وہ ایامِ طفلی کیا بہاریں کیا ہوئیں
جن میں میرے بچپنے کی نرم کلیاں وا ہوئیں

آج بھی وہ معصوم معلوم ہوتے ہیں لیکن شاعری پختہ اور سنجیدہ ہے اور کہیں کہیں چلبلی، الہڑ حسینہ کی طرح نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں فیضؔ صاحب کی طرح جذبات اور ترقی پسندی ہے تو دوسری طرف غلامی کی زنجیریں توڑ پھینکنے کا جذبہ بھی ہے، وہ کہتے ہیں.....

احساسِ غلامی کے شعلے جا پہنچے ہیں زنجیروں تک
مردوں کے وہ ہاتھ جو لرزاں تھے اب بڑھ ہی گئے شمشیروں تک
عشرت کی بہاریں جا پہنچیں مرجھائی ہوئی تقدیروں تک
مذہب کے ترانے کیا چھیڑوں، مذہب کے زمانے بیت گئے

انہوں نے مذہب کو درمیان میں نہیں آنے دیا اور وہ اپنی آزادی کے کے لئے میدان میں کود پڑے اور انہوں نے آزادی کی نظمیں کہیں۔ جوہر صاحب نے گیت، غزل کی صنف میں طبع آزمائی کی، اس میں بھی کامیاب ہیں۔ ان کا مخصوص لب و لہجہ، اندازِ بیان منفرد اور محاورتی

زبان ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ میری خاندانی زبان اردو تھی، ان کے والد بھی اردو بہت اچھی جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو بھی اردو سے اور اردو شاعری سے شوق ہوا اور اردو ان کو ورثہ میں ملی۔

بارہ سال کی عمر سے ہی ہلکے پھلکے شعر کہنے لگے۔ جب وہ کالج میں گئے تو ان کے استاد اردو فارسی کے جو تھے انہوں نے ان کا شوق دیکھا تو مشورہ دیا اور کہا کہ ''اچھے شعر ہیں اور موزوں ہیں، میرا مشورہ یہ ہے کہ تم کسی استاد سے اپنے شعروں کی اصلاح کراؤ، شعر اچھے ہیں لیکن اصلاح ضروری ہے۔''

وہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحبان نے میری شاعری میں بڑا حوصلہ بڑھایا۔ وہ میرے ذوق کی قدر کرتے تھے اور کالج کے ہر جلسے میں میری نظم ضرور پڑھی جاتی تھی۔ مولوی صاحبان میرے ہر شعر پر بڑھ چڑھ کر داد دیتے اور میرا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ انکا نعرہ ہوتا تھا..... ''اللہ کرے ذوقِ سخن اور زیادہ۔''

استاد اگر اچھا مل جائے تو وہ شاگرد خوش قسمت ہوتا ہے۔ جوہر صاحب ترقی کی اس منزل کو چھونا چاہتے تھے۔ وہ اقبالؔ اور ٹیگورؔ بننے کے خواب دیکھنے لگے اور دوست احباب بھی ان کو ایک ہونہار شاعر ماننے لگے۔

جوہر صاحب نے مولانا کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے اپنی دو تین نظمیں علامہ سیمابؔ اکبر آبادی کو بھیج کر ان سے شاگردی میں لینے کی درخواست کی جو انہوں نے منظور کر لی اور لکھا کہ صاحبزادے اگر تمہارا ذوق اسی طرح رہا تو تمہارا نام ضرور ایک دن ہندوستان کے شعراء میں ہوگا۔

پھر کیا تھا۔ اتنے بڑے شاعر نے حوصلہ بڑھایا۔ ان کی شاعری عروج پر پہنچنے لگی۔ زور شور سے لکھنا شروع کر دیا۔ بڑے بڑے میگزینوں میں چھپنے لگے۔ گھر والوں کو جب معلوم ہوا کہ ان کے بڑے بیٹے نے پڑھائی سے زیادہ شاعری کو اپنے گلے کا ہار بنا رکھا ہے تو خاص طور پر والد

صاحب خفا ہو گئے کیوں کہ وہ شاعروں کا حال جانتے تھے۔ وہ ایک کاروباری شخص تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ان کا اکلوتا بیٹا، ان کے گھر کا چشم و چراغ، اردو کا ایک شاعر بن کر، صرف شاعری کو کو ہی اپنا سب کچھ مان لے کیوں کہ وہ شاعروں کا حشر دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا گھر بار، بیوی بچے سب تیاگ دئے تھے۔ جوہر صاحب کے والد نے ان کو ایک خط لکھا جس کو پڑھکر وہ بے چین ہو گئے۔ انہوں نے فوراً سب کچھ چھوڑ دیا کیوں کہ وہ اپنے والد کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر شاعری ان کا شوق، ان کی خوشی تھی تو والد کا حکم ان کی زندگی تھا۔ وہ اپنے والد سے بہت ڈرتے تھے۔ اس کے ڈر کی وجہ سے وہ اندار ہی اندر گھٹتے اور شعر کو تو وہ ایسا سمجھتے جیسے کوئی گناہ۔ انہوں نے شاعری ترک تو کر دی لیکن جب کوئی شعر ان کے اوپر طاری ہوتا تو وہ خود ان کو روک نہیں پاتے اسے لکھ لیتے اور پھر انہوں نے ایک دن خود سے تنگ آ کر ایک شعر کہا.....

؎ اس دل میں موجزن ہے جذبات کا سمندر
تھامے نہیں تھمیں گی ایسی روانیاں ہیں

مشاعروں میں تو انہوں نے جانا بند ہی کر دیا تھا کہ اگر کوئی شعر اخبار میں شائع ہو گیا اور ان کے والد صاحب کو اطلاع ہو گئی تو کیا حشر ہو گا؟ کہتے ہیں کہ ایک بار میرے استاد مولوی صاحبان مجھے بہت اصرار کر کے کالج کے ایک مشاعرہ میں لے گئے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ میں پڑھوں گا تو ضرور جیتوں گا۔ میں نے اپنی نظم ''طفلی'' پڑھی تو سماں بندھ گیا۔ سب ہی کو اپنا اپنا بچپن یاد آ گیا۔ اس وقت میری عمر چودہ برس تھی۔ جب مجھے اتنی داد ملی تو مولانا بہت خوش ہوئے جیسے یہ سب داد ان کی ہی جھولی میں جا رہی ہو۔

میٹرک پاس کر کے جوہر صاحب میرٹھ چلے گئے۔ وہاں بھی اردو بی اے تک کالج میں تھی۔ ان کا ایک مضمون اردو تھا۔ ان کو اردو سے بے حد لگاؤ رہا۔ شاعری تو ان کی ہر رگ میں موجزن تھی، بھلا وہ دل سے کیسے جدا ہوتی۔

انہوں نے اپنی بیگم کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک نیک دل خاتون ہیں۔ ان کی

شادی ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ ہم سفر رفیقۂ حیات ایک پڑھی لکھی اور مہذب گھرانے کی سلیقہ مند خاتون ہیں جن کا تعاون ان کے ہر قدم پر ساتھ رہا اور بیگم کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کام کے لئے جوہر صاحب کو مجبور نہیں کیا۔ کوئی بھی گھریلو کام ہو یا بیرونی یہاں تک کہ بچوں کی پرورش، پڑھائی لکھائی کا ذمہ بھی انہوں نے اپنے ہی اوپر لے لیا تھا۔ شریکِ حیات ایسی ہو تو گھر ہی جنت بن جاتا ہے۔ بیگم نے ان کو ہر طرح کے لکھنے پڑھنے کی پوری آزادی دے دی اور ان کے اندر کا شاعری کا جو لاوا تھا وہ ابل کر باہر آنے لگا۔ جوہر صاحب کی شاعری تپ کر کندن بننے لگی۔ بیگم کبھی ان کے کام میں مخل نہیں ہوئیں بلکہ ہر ہر قدم پر ان کی مدد کی۔ ان کی مدد ہی سے ان کا بیٹا اتنا لائق و ہونہار ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میرا بیٹا اتنا لائق ہے کہ اس نے میرے کاروبار کی تمام ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر لے لی ہیں اور مجھے فارغ البال کر دیا، سارا کاروبار خود ہی سنبھالتا ہے۔

جوہر صاحب کی کچھ نظمیں بے حد اچھی اور نایاب ہیں.....

جاگ اٹھو اے دنیا والو　　سب کچھ پاکر کھونے والو
خلوت کی تاریک فضا میں　　اشکوں سے منھ دھونے والو
تم نے اپنی قدر نہ جانی

یہ نظم انہوں نے عہدِ طفلی میں کہی تھی تو اس وقت ہندوستان میں آزادی کی تحریک بڑے زور و شور سے شروع ہو چکی تھی۔ ان کی ایک اور نظم ''محبت کس طرح کر لوں'' ہے، جو دل کو چھوتی ہی نہیں بلکہ اپنا تاثر بھی چھوڑتی ہے.....

نظر میں کانپتا ہے اک جہنّمِ زار کا منظر
تخیّل کے شبستاں میں دلِ بیدار کا منظر
لرزتے ہیں نگاہوں میں پرخچے زندگانی کے
ہیں کتنے مضحکہ خیز آج ارماں گلِ فشانی کے

ہیں خاک وخون میں لتھڑی ہوئی لاشوں کے پُشارے
فضائیں دہر کی برسا رہی ہیں سرخ انگارے
بتاؤ تو سہی تم سے محبت کس طرح کر لوں

اس وقت ترقی پسندی کا بول بالا تھا اور آزادی کی نظمیں لکھی جارہی تھیں، اس وقت فیض احمد فیض نے اس طرح کہا تھا.....

''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ''

اور جوہر صاحب اس طرح کہتے ہیں.....

''بتاؤ تو سہی تم سے محبت کس طرح کرلوں''

شاعر کا دل بڑا نرم مزاج ہوتا ہے، اپنے وطن سے آزادی اسے اپنی محبوبہ سے زیادہ حسین وخوبصورت اور پیاری ہوتی ہے۔

جوہر صاحب نے جب شاعری شروع کی وہ دور ہندوستان کی آزادی کا تھا۔ ہر خاص وعام کی زبان پر آزادی کے ترانے گونجتے رہتے، آزادی کی نظمیں کہی جارہی تھیں، جوہر صاحب نے بھی آزادی کی نظمیں کہیں۔ ہندوستان کی آزادی سے قبل ملک کا ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر گاؤں اپنی مشترکہ تہذیبی پہچان بنائے ہوئے تھا۔ جوہر صاحب چونکہ میرٹھ سے تعلق رکھتے ہیں اور میرٹھ کی اپنی ایک الگ پہچان ہے، میرٹھ کو ایک امتیازی اور غیر معمولی شہرت حاصل ہے جس کو گنگا جمنی تہذیب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ علم، ادب، تاریخ، سیاست، محبت، تصوف اور موسیقی کے چشمے یہاں سے پھوٹتے رہتے تھے، جوہر صاحب کو انقلابی شاعر تو نہیں کہا جاسکتا لیکن وہ ترقی پسند تہذیب کے حامل ہیں۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں.....

بحر تہذیب میں برپا ہے یہ طوفان کا شور
ہے قیامت کی صدا فتنہ گر انسان کا شور
سینۂ تیرہ و تاریک میں ارمان کا شور
توبہ توبہ کہ یہ اس بے سرو سامان کا شور

جوہر صاحب کا مزاج بھی پہلے نظموں کی طرف مائل ہوا۔ ان کی ہر نظم شیریں لفظوں کا امتیاز ہے اور بیشتر شاعر اپنی نظموں سے شہرت کی بلندیوں تک پہنچتا ہے۔ غزل میں بھی ان کے مزاج کا رنگ جگہ جگہ نظر آتا ہے اور دلی کیفیت کو بے کم و کاست بیان کرنے کا فن وہ خوب جانتے ہیں

ے ترا حسن کافرانہ، مرا عشق والہانہ
نہ تھے خبر تھی اپنی، نہ مرا کوئی ٹھکانہ
مجھے دیکھ کر کسی کا سرِ راہ مسکرانہ
یہی بات تھی ذرا سی یوں ہی بن گئی فسانہ

وہ یہ بھی کہتے ہیں.....

ے صبح کی دھوپ میں گلاب کھلے
زلف کے سائے میں شباب کھلے

حسن و عشق اور شباب بھی شاعر کی زندگی کا ایک حصہ ہوتا ہے جس کے بغیر وہ بے معنی ہے۔

OO

Anwar Nuzhat
H-1, Batla House, Muradi Road,
Jamia Nagar, New Delhi

○ فصیح اکمل قادری

ایک طلسمِ جہانِ آرزو

شاعر کا کام زندگی کے حسن کو خود دیکھنا اور دوسروں کو دکھانا ہے۔ زندگی کے ناسوروں کے علاج کی کوشش کرنا اس کا کام نہیں، اس میں شک نہیں کو موجودہ زمانے نے بعض ایسے ناگوار مسئلے ہمارے سامنے لا رکھے ہیں جن سے گریز ممکن ہے نہ مصالحت، سیاست میں عوام کی آرزو اور خیالات کا اثر بڑھ گیا ہے۔ اقتصادی کشمکش ہمہ گیر ہوتی جارہی ہے۔ تجارتی لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری نے سماج کے ہر ایک طبقہ کو لپیٹ میں لے لیا ہے اور بیشمار ملک اور گروہ ہماری دنیا کے خوبصورت جسم پر بڑے بڑے ناسور بن کر رہ گئے۔ ہم شاعر بھی انسان ہونے کی حیثیت سے ان اثرات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے لیکن ہمارا ان ناسوروں کی جراحی کر کے انہیں ٹھیک کرنے کی کوشش کرنا ایک اناڑی کی کوشش سے زیادہ نہ ہوگا۔ انکا علاج تو سیاسی اور اقتصادی ماہروں کے ہاتھ میں ہے اور انہی پر علاج کا فرض بھی عائد ہوتا ہے..... میرے نزدیک شاعر کے لئے اپنے آپ کو کسی سیاسی یا اقتصادی نظام سے وابستہ کرنا ضروری نہیں۔ وہ نظام سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت، جمہوریت ہو یا فاشیست، شاعر کے لئے ان میں سے ایک بھی قابلِ توجہ نہیں۔ شعر کی قدریں ان سب سے الگ اور آزاد ہیں۔

(اختر شیرانی..... ریڈیائی تقریر سے ماخوذ، ۱۹۴۲ء)

اردو شاعری میں اختر شیرانی اپنی اثر انگیزی، رومان پروری اور زندگی کی حقیقی اقدار کی نمائندگی کے لئے بے حد معتبر حوالہ ہیں۔ ان کی شاعری کا عہد بھی وہی ہے جب بی ایس جین جوہر

تقریباً انہیں احساسات ونظریات کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔اس ۵۵،۶۰ سال میں اردو شاعری کے مناظر نامے پر تحریکات کے عمل اور ردِ عمل کے کئی افق روشن ہوئے اور ناموروں کی ایک مسلسل ومتواتر کہکشاں منور ہوتی گئی۔ادبی اعتبار سے کون پایۂ اسناد تک پہنچا اور کون نہیں یہ ایک الگ بحث ہے اور فی الوقت یہ موضوع بھی نہیں ہے۔بی ایس جین جوہر کے مجموعۂ کلام میں اردو کے معتبر شاعر رفعت سروش نے ان کے تعارف کے حوالے سے لکھا ہے کہ.....''ان کے والد آنجہانی رسال سنگھ جین ایک متمول شخص تھے۔اردو میں اچھی قابلیت رکھتے تھے اور انہیں شاعری کا بھی شوق تھا۔گویا شاعری انہیں ورثہ میں ملی۔بی ایس جین جوہر نے فخر سے لکھا ہے کہ.....میری خاندانی زبان اردو ہے..... یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا آج تصور بھی ممکن نہیں ہے۔آج تو حال یہ ہے کہ جن مسلم گھرانوں کی تہذیبی اقدار وروایات اس زبان کے حوالہ تھیں افسردگی کے علاوہ کچھ باقی نہیں بچا ہے۔جس دور کا بی ایس جین جوہر صاحب نے حوالہ دیا ہے اس دور کے بیشتر دوست ہندو گھرانوں میں اردو اوڑھنا بچھونا تھی۔میں نے دہلی لکھنؤ میں ایسے بیشتر خاندان دیکھے ہیں جو ان تہذیبی اقدار کے امین وپاسدار تھے،جن کا نام ونشان خود مسلم گھرانوں میں دور دور تک نہیں ملتا''واحسرتا'' شاید اسی کا نام ہے''تلك الأيام نُداولهابين النّاس ة ''شاعری اکتسابی فن نہیں خداداد چیز ہے اور وہ تصورات وخیالات جو بچپن سے انسان کے ذہن میں پرورش پاتے ہیں۔لڑکپن میں ہی اپنے لئے وسیلۂ اظہار تلاش کر لیتے ہیں چنانچہ بی ایس جین جوہر صاحب بارہ سال کی عمر سے ہی شعر کہنے لگے اور ان کی طبع رسا کے جوہر خاص طور پر نظموں میں ابھر کر سامنے آئے۔ان کو مطالعہ کا شوق تھا۔اردو ادب سے خاص طور پر دلچسپی تھی لیکن ان کے والد انہیں فاقہ مست اردو شعراء کی صف میں شامل نہیں کرنا چاہتے تھے (مجھے اس پورے جملے پر اختلاف ہے،ف،ا) چنانچہ انہوں نے بروقت انکی رہنمائی کی اور ان کی زندگی کا رخ ادب سے تجارت کی طرف موڑ دیا (بی ایس جین جوہر کی شاعری.....رفعت سروش)

دوسو بہتر (۲۷۲) صفحات پر اردو اور ہندی کے التزام کے ساتھ ان کی فکر کے مختلف

گفتنی

اردو کیا ہے؟ یہ ہندوستان میں کب وارد ہوئی ؟ اس زبان کی دلکشی اور رعنائی کے اسباب کیا ہیں؟ ان سب کا جواب درج ذیل چار مصرعوں میں پیش ہے:

چار صدیوں پہلے آیا ایک انوکھا انقلاب
محفلِ فطرت میں ایک ہنگامہ بَرپا ہُو گیا
چاندنی، شبنم، شفق، نکہت، تجلّی، کہکشاں
جَب ہوئے یکجا تو ان کا نام اردو ہو گیا

اسی ست رنگی اردو زبان کے ایک شیدائی اور فِدائی جوہر صاحب ہیں جو عقیدے سے جین مسلک کے پیروکار ہیں، اور اس جین مذہب کے، جس کے بانی مہاویر سوامی، جو تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے ہماری پوتر دھرتی پر، پریم، سد بھاونا اور ایکتا و انسانیت، کی کرنیں، چہار سو پھیلانے کے لئے آئے تھے! مساوات، شانتی، بھائی چارہ، پریم، سادگی، انسانیت اور اخلاقیت، جین مذہب کی تعلیمات کے بنیادی عناصر ہیں! شری بی ایس جین جوہر میں مذکورہ تمام اوصاف بدرجہء اتم موجود ہیں۔ جوہر صاحب میرٹھ کے نواسی ہیں، وہ اپنے ذاتی احوال و کوائف کے ذیل میں یوں رقم طراز ہیں:

''کیا لکھوں، کیا کہوں۔ ایک چھوٹے سے قصبہ امین نگر سرائے کے ایک متمول گھرانے میں ۱۹۲۷ء میں جنم لیا، میرے آبا و اجداد اس علاقے کے

اصناف میں جواہر پارے، شاعری کے سنجیدہ قاری کو مختلف کیفیات سے دوچار کرتے ہیں۔ انیس (۱۹) نظمیں، اکتیس (۳۱) غزلیں، سینتیس (۳۷) قطعات اور بارہ (۱۲) دوہے، فنِ شعر پر ان کی مہارت اور بیانیہ کے مختلف اسالیب پر قدرت کے آئینہ دار ہیں۔

مجموعہ کی پہلی نظم ''ترانۂ بیداری'' جو ۱۳/مئی ۱۹۴۴ء کے اس دور کی نظم ہے جب میری عمر شاید چار یا پانچ ماہ کی رہی ہوگی۔ کچھ منظومات، ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء کی بھی ہیں جو ظاہر ہے میری عمر سے دو یا تین سال بڑی ہیں۔ مجھے ان منظومات کو پڑھتے ہوئے ایک الگ ہی احساس ہوتا ہے۔ ''ترانۂ بیداری'' کے کل نو (۹) بند ہیں اور کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ شاعر کے لہجے میں ''آورد'' کی کیفیت ہے۔ پہلا بند ہے.....

جاگ اٹھو اے سونے والو　　سب کچھ پاکر کھونے والو
خلوت کی تاریک فضا میں　　اشکوں سے منھ دھونے والو
تم نے اپنی قدر نہ جانی

اور آخری بند.....

پھولوں سے شادابی لے کر　　جگنو سے بے تابی لے کر
زہرہ کی ننھی شرمیلی　　آنکھوں سے بے خوابی لے کر
راہ میں اپنی بڑھتے جاؤ

پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ اس آخری بند کا سرمایہ ہنوز جوہر صاحب کے ساتھ ہے کیوں کہ عمر کی اس منزل پر جب قدموں میں لرزش اور قویٰ میں اضمحلال کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے، ان کے یہاں ''پھولوں کی شادابی''، ''جگنو کی بے تابی''، ''زہرہ کی شرمیلی آنکھوں کی بے خوابی'' اپنا جادو جگائے ہوئے ہے۔ اس پورے عہد میں اگر دیکھئے تو کتنے چراغ اردو شعروادب کی بساط پر پوری آب وتاب کے ساتھ روشن ہوئے اور ع ''خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود'' کے مصداق آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔ جوہر صاحب اگر پوری توانائی سے اب بھی

بساطِ شعروادب پر چراغوں میں اضافہ کرتے جارہے ہیں تو اس میں کچھ ان کی ثابت قدمی، حوصلہ مندی اور پاک دامنی کے عناصر کی کارفرمائی ضرور ہے۔ شاعری ایک بار زندگی حاصل کرنے کے بعد فنا نہیں ہوتی اس کی ترکیب وساخت ہی ایسی ہے کہ یہ اپنے خاکستر سے دوبارہ زندگی حاصل کرے اور یہ دوام حاصل کرنے کی اہل ہوتی ہے۔ ان نشانات کو تازہ رکھنے کی جو اس میں پہلے سے موجود تھے، اسی خصوصیت کے ذریعہ شاعری کی شناخت کی جاسکتی ہے یعنی یہ اپنی اصل شکل میں دوبارہ وجود میں آنے کا باعث ہوتی ہے۔ یہ ہمیں ایک مماثل انداز سے اپنی تشکیلِ نو کی طرف ترغیب دلاتی ہے۔'' (پال وطیری)

اس طرح اگر جوہر صاحب کی شعری بساط کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں مختلف کیفیات سے دوچار ہوتی ان کی شاعری ''اپنی خاکستر سے دوبارہ زندگی حاصل کرنے کا عمل'' بھی نظر آتی ہے اور اپنی خصوصیات کی بنیاد پر ''تشکیلِ نو'' کی جانب بھی قدم بڑھاتی محسوس ہوتی ہے۔ ممکن ہے اور لوگ اس طرح ان کی شعری صلاحیتوں کو جائزہ نہ لیں لیکن میں نے ان کے کلام میں محسوسات کی جو زیریں دنیا دیکھی ہے اس سے معاً میرے ذہن میں ''پال وطیری'' کی یہ عبارت تازہ ہوگئی۔

میں بہت زیادہ ممنون ہوں اپنے برادرِ خورد خالد حسین خاں صاحب کا جن کی وجہ سے میں بی ایس جین جوہر کی ان کاوشوں سے متعارف ہوا، میں لکھنا تو بہت کچھ چاہتا تھا لیکن گزشتہ کئی ماہ سے ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی میں وہ توانائی محسوس نہیں کرتا جو اس سے قبل کبھی تھی۔ اس مضمون کے تشنہ رہ جانے کا مجھے بھی افسوس ہے لیکن مجھے امید ہے کہ جوہر صاحب اپنی نیک نفسی اور خالد میاں اپنی پاک باطنی کے زیرِ اثر میری معذوری کو درگذر کردیں گے۔

OO

Faseeh Akmal Qadri
L-1, Batla House, Near Masjid Khalilullah, Jamia Nagar,
Okhla, New Delhi-110025
Mobile : 09313078398

○ ڈاکٹر ثروت خان

بی ایس جین جوہرؔ کا ''ترانۂ بیداری''.....ایک تجزیہ

وارداتِ قلب کے اظہار کو ہی تغزل کا اصلی رنگ سمجھا جاتا تھا۔ بائرن نے اسے لاوے کی تشبیہ دی ہے کہ ''وہ خود بخود اندر سے پھوٹتا ہے''۔ کیٹس نے کہا ہے کہ ''شاعری پتوں اور پھولوں کی طرح نہیں اگتی تو بیکار ہوتی'' اور غالبؔ نے اسی بات کو شاعرانہ انداز میں اس طرح کہا ہے ۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

غالبؔ کے اسی خیال کو ذہن میں رکھ کر اگر گذشتہ ساٹھ ستر برس کی شاعری کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے وسیع میدان میں زندگی کے ہر پہلو، ہر مسئلہ، ہر حادثہ کو شعرا نے کمال چابکدستی سے بیان کیا ہے جس میں اس دور کے مزاج، عصری تقاضے، تہذیبی مطالبات پس پردہ کام کرتے رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ادب کی دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ شاعری کا کینوس بھی وسعت کے اعتبار سے خاصا وسیع رہا ہے۔

زیرِ نظر شعری مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' بی ایس جین جوہرؔ کی گزشتہ پچاس سالہ شعری و ادبی زندگی کا تجربہ ہے۔ اسے غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا سنگم بھی کہا جاسکتا ہے اور داخلیت و خارجیت کا کیمیا بھی جس میں روایتی رومان ہے تو سماجی و سیاسی نشیب و فراز کی اٹھتی لہریں بھی ہیں۔ ملک کی آزادی کا مسئلہ ہو، جنگِ عظیم کے ہولناک سائے ہوں، وطن کی محبت کا قیمتی جذبہ ہو یا عاشق کا روایتی لیکن تازگی و شگفتگی بھرا اندازِ تخاطب..... جوہرؔ نے ان تقاضوں کا بھرم رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

علامہ عاشق حسین سیمابؔ اکبر آبادی کے شاگرد بی ایس جین جوہرؔ کے اس مجموعے کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ انہوں نے آنکھ بھی اسی دور میں کھولی جب نظم نگاری میں بہار آئی ہوئی تھی حالانکہ وہ غزل میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن جس خوبصورتی اور فنکاری سے نظم کے باغات لگائے چلے جاتے کہ جنکی فرحت بخش فضا میں دل

اور نظر، رومان کی سیر پر نکلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ''فطرت کے پجاری'' نظم میں ہندوستانی مٹی کی خوشبو کو یوں رچایا بسایا گیا ہے.....

دور کہیں وہ گونج رہی ہے رادھا کی آواز
ایک معمہ ہے وہ شاعر اور سراپا راز
شبنم کی موسیقی ہے اور بادِ سحر کا ناز
اس نغمے پر جھوم کے بدلی اٹھا رہی ہے ساز
اے شاعر، اے حسن کے شیدا، اے فطرت کے پجاری

ہر کامیاب ادب، ہر دور کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں لکھی گئی اس نظم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو حالات اس وقت تھے، انہی حالات و سانحات سے آج بھی انسان کا سامنا ہے۔ اسے عالمی تناظر میں دیکھیں.....

جنگ و جدل کے شعلے ہر سو، اک موجِ طوفانی
امن و محبت کے ساگر میں آئی ہے طغیانی
کھیل رہی ہے خاک و خوں سے پھر نسلِ انسانی
اپنے فرض سے غافل ہونا ہے تیری نادانی
اے شاعر، اے حسن کے شیدا، اے فطرت کے پجاری

جوہر نے جنگِ عظیم کی ہولناکی کی ترجمانی بھی بڑے موثر انداز میں کی ہے اور پھر جب ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ملک اور سماج پر یہ ذمہ داری واجب ہو گئی کہ وہ غلامی سے بیزار ہو کر جنگِ آزادی میں شریک ہو جائیں اور ایسے میں ہمارے شعرا نے عورت کو بیدار کرنے کے لئے جہاں ایک طرف آنچل کو پرچم بنانے کی صلاح دی، وہیں جوہر ظاہری زیبائش کو ''حسیں زنجیر'' کی تشبیہ دیتے ہوئے للکارتے ہیں کہ..... ''اسے توڑ ڈالو، یہ زہریلی فضا ہے جس کے حصار میں تو قید ہے، اس فضا سے نکل.....'' دیکھئے یہ اشعار ۔

یہ صراحی دار گردن میں تری سونے کا ہار
مانگ لیتا ہے پناہیں جس سے سینے کا ابھار

کاش اے عورت کہ تو اس زندگی سے اوب جائے
کاش تجھ کو کوئی زہریلی فضا سے کھینچ لائے
توڑ ڈالے یہ حسیں زنجیر آ کر جوش میں
جس کو کنگن ہی بنا ڈالا ادائے ہوش میں

میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ جوہر کی شاعری پڑھنے کے لئے قاری کو پچاس سال پیچھے جانا ہوگا۔ مثال کے طور پر ان کی ایک بے حد خوبصورت نظم ''نجمہ سے'' یاد دلاتی ہے اختر شیرانی کی ''سلمیٰ کی، مرجینا کی، اور بہت سی حسیناؤں کی'' اس رومانی نظم سے قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جوہر کی شاعری میں جہاں ایک طرف تاریخی سچائیاں ہیں وہیں ان کی غزلوں میں دورِ حاضر کی سفاک حقیقتیں صنفی نزاکتوں کے ساتھ قاری کے روبرو ہیں.....

ڈگمگاتی ہے دھماکوں سے زمیں
آسماں زیر و زبر لگتا ہے
غیر تو غیر ہمیں آج کے دن
اپنے ہمسائے ڈر لگتا ہے

مذہبی تفریق، کدورت، تعصب، طبقاتی کشاکش اور آپسی نفاق سے گھبرا کر شاعر یہ نہ کہے تو کیا کہے کہ۔

جسے سب محبت سے مل کر مناتے
کوئی ایک ایسا بھی تہوار ہوتا

نئی نسل بے روزگاری کی شکار ہے۔ تلاشِ معاش میں غریب الوطن ہونا مجبوری ہے۔ پیٹ خالی ہو تو ذہن، مشن، وژن سب کچھ چوپٹ ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں جوہر کہتے ہیں۔

فضائیں سازگارِ عشق ہوتیں
تو میں تم سے محبت کیوں نہ کرتا

نہیں ہے گھر کی دولت میں مرا ہاتھ
میں ہوں مجبور دولت کی کمی سے

''ترانۂ بیداری'' میں نظموں اور غزلوں کے علاوہ دوہے بھی ہیں جو قاری کو سرشار و سیراب کر دیتے ہیں۔ خیر و شر کے تصادم سے برآمد نتائج کو جو ہر حیران و پریشان ہو کر بے اختیار پکار اٹھتے ہیں ۔

رہزنوں کا ہے راج سڑکوں پر
لٹتی ہے گھر کی لاج سڑکوں پر
نسلِ انساں ہے حادثوں کی شکار
خون بہتا ہے آج سڑکوں پر

سماجی تبدیلیوں اور بدلتی قدروں کا احساس، طبقاتی کشاکش، معاشی حالات کا جبر، صنعتی و سائنسی ترقیوں اور ان کے سماجی رشتوں اور رویوں پر اثرات، اشخاص کی ذہنی و جذباتی گھٹن، احتجاجی فکر، ایسے نوکیلے اور چبھتے ہوئے سوالات اٹھتے ہیں جن کے سامنے انسانیت ہی برہنہ ہو کر رہ گئی ہے ۔

کفِ گل میں جس سے دیا جل رہا ہے
وہی خوں رگِ خار میں چل رہا ہے
گلوں سے کیا پیار کانٹوں سے نفرت
یہ انسان صدیوں سے پاگل رہا ہے

ہندی اور اردو زبانوں میں چھاپا گیا یہ شعری مجموعہ بلاشبہ مطالعہ فن کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے اور قاری کے مطالبات کو بھی۔

مطبوعہ ماہنامہ ''انشاء'' (جنوری و فروری 2006)

OO

Dr. Sarwat Khan
76, O. T. C. Scheme (Behind Chowk Hostel)
Central Academy Road, Mulla Talai, Udaipur (Rajasthan)

○ ڈاکٹر مجاہد فراز

''ترانۂ بیداری'' جوہر کے بیدار ذہن کا آئینہ

اردو کی شیرینی اور دلکشی کی اس سے زیادہ جیتی جاگتی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ یہ زبان ملکوں کی تعین کردہ سرحدوں، انسانوں کی بنائی ہوئی ذات پات، مذہبی تفریق، رنگ و نسل کی دیواروں، غرض کہ ہم قسم کی پابندی سے آزاد ہے۔ ہم اس بات پر فخر کرسکتے ہیں کہ اردو ہمارے وطن ہندوستان میں پیدا ہوئی لیکن آج یہ سات سمندر پار آباد یورپی و امریکی ممالک میں بھی اپنی جڑیں اتنی مستحکم کرچکی ہے کہ وہاں کی یونیورسٹیز میں اردو ڈپارٹمنٹ قائم ہیں اور ان ممالک میں آباد اردو داں طبقہ اپنی زبان کی آبیاری میں کوئی کسر باقی نہیں رکھ رہا ہے۔ اس طرح جو لوگ اردو کو کسی ایک مذہب یا فرقے کی زبان سمجھتے ہیں وہ اس تاریخی حقیقت کو کس طرح نظر انداز کرسکتے ہیں کہ اگر اردو زبان کے فروغ میں مسلمانوں کی قربانیاں شامل ہیں تو دیگر مذاہب کے ماننے والوں نے بھی اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ اگر اردو زبان کو میرؔ و غالبؔ، داغؔ و فانیؔ، جگرؔ و فیضؔ جیسے عظیم شعراء پر فخر ہے تو لبھو رام جوشؔ ملسیانی، پنڈت برج نارائن چکبستؔ، کالی داس گپتا رضاؔ، رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھ پوری، کنور مہندر سنگھ بیدیؔ سحرؔ اور کرشن بہاری نورؔ جیسے بے شمار غیر مسلم شعراء کے نام بھی اردو ادب کے آسمان پر ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ جب جب کوئی متعصب یا تنگ ذہن اردو زبان پر مسلمانوں کی زبان ہونے کا الزام لگاتا ہے تب تب اردو اپنے سمندر کے خزانے سے کوئی ایسا نام سطحِ ادب پر لے آتی ہے جس کا تعلق غیر مسلم طبقے سے ہو اور جو اپنی اردو نوازی و خدمات کے ذریعے ان تنگ ذہنوں کی زبانوں پر قفل لگا دیتا ہے۔ اسی سلسلے کی تازہ کڑی جناب بی ایس جین جوہرؔ ہیں۔ ہر چند کہ جوہرؔ صاحب کا تعلق اردو زبان سے نیا

نہیں ہے بلکہ وہ گزشتہ نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے سے اس گلشنِ پُر بہار کی سیر کر رہے ہیں لیکن چونکہ وہ ایک مصروف ترین تاجر ہیں، کاروباری مصروفیات نے انھیں اپنی شخصیت کو منظرِ عام پر لانے کا زیادہ وقت میسّر نہیں ہونے دیا۔ اب جبکہ ان کا مجموعۂ کلام ''ترانۂ بیداری'' شائع ہوا ہے تو دنیائے ادب پر جوہر صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کے جوہر عیاں ہوئے ہیں۔ ان کے مجموعے کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ جوہر صاحب کی پرورش خالص اردو ماحول (جسے ہندوستانی تہذیب بھی کہہ سکتے ہیں) میں ہوئی۔ عہدِ طفلی ہی سے ان کے اندر ایک اچھا شاعر چھپا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف بارہ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام ''ترانۂ بیداری'' ان کے بیدار ذہن اور جاگتی فکر کا آئینہ ہے۔

نظم ان کی محبوب صنفِ سخن ہے حالانکہ وہ میدانِ غزل کے بھی ایک باکمال شاعر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جس وقت ہوش سنبھالا، وہ دور نظم کے لئے سازگار تھا۔ دنیا ایک انقلابی دور سے گذر رہی تھی۔ خود ہندوستان اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ جس کا اظہار ان کی نظم ''مذہب'' میں اس طرح کیا گیا ہے.....

احساسِ غلامی کے شعلے جا پہنچے ہیں زنجیروں تک
مردوں کے وہ ہاتھ جو لرزاں تھے اب بڑھ ہی گئے شمشیروں تک
افلاس کی کھیتی جلتی ہے غربت کا جنازہ وہ دیکھو
عشرت کی بہاریں جا پہنچی مرجھائی ہوئی تقدیروں تک
مذہب کے ترانے کیا چھیڑوں مذہب کے زمانے بیت گئے

ان کی نظم ''ترانۂ بیداری'' بھی ایسے ہی ماحول میں کہی گئی ہے جس میں ایک سچا شاعر وقت کی رفتار کو محسوس کرتے ہوئے اپنے دیش کے جوانوں کو بیدار کر رہا ہے.....

جاگ اٹھو اے سونے والو — سب کچھ پاکر کھونے والو
خلوت کی تاریک فضا میں — اشکوں سے منھ دھونے والو
تم نے اپنی قدر نہ جانی

موت سے کھیلو آگ سے کھیلو　　زر داری کے ناگ سے کھیلو
ہمّت کے گہرے سائے میں　　اپنے چھوٹے بھاگ سے کھیلو

مجبوری کا نام نہ چھوڑو

پھولوں سے شادابی لے کر　　جگنو سے بے تابی لے کر
زہرہ کی ننھی شرمیلی　　آنکھوں سے بے خوابی لے کر

راہ میں اپنی بڑھتے جاؤ

نظم کے ہر ہر بند سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہمت اور حوصلے کی ایسی روح اپنے جوانوں میں پھونکنا چاہتے ہیں جس کی ملک کو ضرورت ہے۔ یہ کام ظاہر ہے ایسا فن کار ہی کر سکتا ہے جو خود جواں ہمت اور چٹان کی طرح مضبوط حوصلے کا مالک ہو۔

جوہر کی بیشتر نظمیں ان کے اندر کے اس شاعر سے متعارف کراتی ہیں جو حسن کا پرستار بھی ہے اور عشق کا طرفدار بھی، سماجی برائیوں و جنگ و جدال سے بیزار بھی ہے اور امن و آتشی کے لئے برسرِ پیکار بھی۔ یہی جذبہ ان کی نظم ''محبت کس طرح کرلوں'' کے اس بند میں جھلکتا ہے.....

نظر میں کانپتا ہے اک جہنمِ زار کا منظر
تخیّل کے شبستاں میں دلِ بیدار کا منظر
لرزتے ہیں نگاہوں میں پرخچے زندگانی کے
ہیں کتنے مضحکہ خیز آج ارماں گل فشانی کے
ہیں خاک و خون میں لتھڑی ہوئی لاشوں کے پشتارے
فضائیں دہر کی برسا رہی ہیں سرخ انگارے
بتاؤ تو سہی تم سے محبت کس طرح کر لوں

ان کی نظم ''محبت کس طرح کرلوں'' اور ''نجمہ سے'' پڑھتے ہوئے مجھے بے اختیار ساحر لدھیانوی کی کئی نظمیں یاد آ گئیں جن میں کچھ ایسے ہی جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ ساحر لدھیانوی نے اپنی نظم ''کسی کو اداس دیکھ کر'' میں کہا ہے.....

تمہیں اداس سی پاتا ہوں میں کئی دن سے
نہ جانے کون سے صدمے اٹھا رہی ہو تم
وہ شوخیاں، وہ تبسّم، وہ قہقہے نہ رہے
ہر ایک چیز کو حسرت سے دیکھتی ہو تم

وہ آگے چل کر کہتے ہیں.....

وہ مال روڈ پہ کاروں کی ریل پیل کا شور
یہ پٹریوں پہ غریبوں کے زرد رو بچّے
وہ شاہراہوں پہ رنگین ساریوں کی جھلک
یہ جھوپڑوں میں غریبوں کے بے کفن لاشے
یہ سب بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

اوراب جوہر صاحب کی نظم ''نجمہ سے'' کا یہ بند ملاحظہ ہو.....

یہ آنسوؤں کا تلاطم، یہ یاس کیا معنی
یہ تیرا چاند سا مکھڑا اداس کیا معنی
یہ تیرے سرخ پپوٹے ہیں نیند سے بوجھل
یہ کیسے بھیگ گیا تیرا ململی آنچل
بتا بتا کہ ہے کیوں اشکبار اے نجمہ

نظم ''معذرت'' کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں.....

کوئی ہے سوختہ سامان و خستہ حال و حزیں
اور اپنی دھن میں مدھر گیت گا رہی ہو تم
میں رو رہا ہوں اگر اپنی قوم کا رونا
تو کس کی یاد میں ٹسوے بہا رہی ہو تم

نامی گرامی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پڑھے لکھے اور روشن خیال لوگ تھے۔ میری خاندانی زبان اردو تھی۔ میرے والد اردو کی اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ شعر و شاعری کا بھی تھوڑا شوق تھا وہی شاید مجھے ورثہ میں ملا۔''

(کچھ اپنے بارے میں، ترانۂ بیداری ص ۴۲)

اردو سے ان کا والہانہ لگاؤ، ہر دھرم سے نبھاؤ، ہر شخص سے مدھر برتاؤ اور انسانیت کا سبھاؤ، جین عقیدہ و آستھا کی انسان دوستی اور آپسی بھائی چارے کی یہی خوبیاں اور محبوبیاں، جین جوہر کی سرشت اور یہی ان کی پہچان بھی ہے! انہوں نے مغربی یوپی کے سب سے قدیم اور عظیم میرٹھ کالج میں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک تعلیمی مراحل طے کئے۔ انگریزی اور ہندی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اردو کو بطورِ خاص، اپنی تہذیبی وراثت، اپنی شعری ریاضت اور اپنی تخلیقی ریاست میں شامل کیا ہے چونکہ اردو ان کی مادری زبان ہے اور یہی ان کی پہچان بھی ہے اور اس پر انہیں بجا طور پر ناز بھی ہے!!

جوہر صاحب، حقیقتاً، اسمِ بامسمّٰی ہیں یعنی مختصر خاندان، شیدائِ اردو زبان، مختلف زبانوں کے زباندان، قدیم رنگِ شاعری کے مزاج داں، شعرائے اردو کے جمِ غفیر میں شاعرِ غیر مسلماں، جدید رنگِ شاعری کے نغمہ خواں، سیکولر روایات کے پاسباں، قومی یکجہتی کے زمزمہ خواں، دبستانِ سیماب کے رازداں، اور اردو شاعری کے آسماں، جوہر صاحب کے امتیازات ہیں!

جوہر صاحب پیشے سے تاجر ہیں اور مزاج سے شاعر ہیں، باتوں کے دھنی ہیں اور دل کے غنی ہیں، شیریں زبان اور شیریں بیان ہیں۔ سنجیدہ اور متین ہیں، بلا کے ذہین ہیں، ان کی لڑکپن سے اردو سے یاری ہے اور شاعری جان سے پیاری ہے! جوہر صاحب نے اردو زبان اور اردو شاعری کو ایک محبوبہ کی طرح چاہا اور اس کی ناز برداری، اس کے غمزے اور اس کے عشوے گذشتہ چھ عشروں سے کبھی چھپ کر اور کبھی کھل کر اٹھاتے چلے آرہے ہیں، اس کا ثبوت، ان کی اوّلیں وقیع منظوم تخلیق ''ترانۂ بیداری'' ہے جو نصف صدی بعد چھپ کر قارئین کے دلوں کو مسحور

نہ بھر سکا مرے جیون میں کوئی رنگینی
یہ سبز باغ مجھے کیوں دکھا رہی ہو تم
فسانہ ہائے محبت مجھے عزیز نہیں
مری نگاہ میں چمپا یہ کوئی چیز نہیں

بی ایس جین جوہر کی غزلیں اردو غزل کی قدیم روایت کی پاس دار نظر آتی ہیں۔ انھوں نے حدیثِ لب و رخسار بھی لکھی ہے۔ محبوب کی شوخیوں اور اداؤں کے قصے بھی بیان کئے ہیں۔ عشق کی دشواریوں کو بھی اپنی غزلوں میں سمویا ہے مگر انتہائی سلیقے کے ساتھ اور ادب کی عظمت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے۔ اسی لئے ان کا عشق کہیں بازاری نظر نہیں آتا :

ترا حسن کا فرانہ مرا عشق والہانہ
نہ تجھے خبر تھی اپنی نہ مرا کوئی ٹھکانہ
کبھی ہم نے بھی نہ سوچا کبھی تم نے بھی نہ جانا
کہ یہ دو دلوں کا سودا ہے بڑا کٹھن نبھانا
حسن کے پرستاں میں اک سے ایک بڑھ کر ہے
کس کو نازنیں کہئے، کس کو دلربا کہئے

عشق اور انتظار کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ انتظار اردو کے کسی منجھے ہوئے شاعر کی طرح جوہر کی غزل کا حصہ بنتا ہے.....

نغمے تڑپ رہے ہیں دلِ بے قرار میں
آنکھیں برس رہی ہیں غمِ انتظار میں

وہ دنیا کو پیار کی خوشبو سے مہکتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے حضرتِ انسان کا سمجھدار ہونا ضروری سمجھتے ہیں.....

اگر آدمی کچھ سمجھدار ہوتا تو دنیا میں بس پیار ہی پیار ہوتا

محبوب سے اس کی بیوفائی کا شکوہ اردو شاعری کی دیرینہ روایت ہے، اس روایت کو

جوہر نے بھی نبھایا ہے، وہ بھی بالکل اساتذہ کے سے انداز میں جہاں زبان کی چاشنی اور اندازِ بیان دونوں نے اپنے رنگ بکھیرے ہیں.....

بات غیروں سے تو ہنس ہنس کے کیا کرتے ہو
ہم سے ہوتے ہی ملاقات خفا ہوتے ہو

دور ہوتے ہو تو ناراض رہا کرتے ہو
پاس رہتے ہو تو دن رات خفا رہتے ہو

عہدِ وفا کسی سے محبت کسی کے ساتھ
کیوں کھیلتے ہیں آپ مری زندگی کے ساتھ

جوہر صاحب نے قطعات اور دوہے بھی کہے ہیں۔ ان اصناف میں بھی انھوں نے کامیاب تجربے کئے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ اپنے قطعے بعنوان ''زبان'' میں انھوں نے اردو، ہندی کے جھگڑے کو بہت آسانی سے حل کیا ہے.....

جس میں بچے زبان کھولتے ہیں
جس میں من کی مٹھاس گھولتے ہیں
ہندی اردو کا جھگڑا مٹ جائے
ہم وہ لکھیں جو گھر میں بولتے ہیں

سیاسی رہنماؤں کے خلاف انھوں نے انتہائی جارحانہ انداز میں زبان کھولی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ان کا قطعہ بعنوان ''مذہب'' .....

مذہب کی ترازو میں وطن بانٹ رہے ہیں
میدانِ سیاست میں لہو چاٹ رہے ہیں
یہ دیش کے نیتا تو ہیں خود اپنے ہی دشمن
جس شاخ پہ بیٹھے ہیں اسے کاٹ رہے ہیں

''دوہا'' جوایک ہندی صنف ہے، اس صنف میں بھی انھوں نے اپنے اندر کے شاعر کو ثابت کیا ہے.....

جھرنے گاتے ہیں سدا بیداری کے راگ
دنیا میں جو سو گیا اس کے پھوٹے بھاگ
دکھ سکھ سب کے ساتھ ہے آفت سب کے ساتھ
کس کا اس سنسار میں کون بٹائے ہاتھ
روپ، جوانی، کامنا ہیں دولت کے کھیل
سوکھے ہوئے درخت پر چڑھتی نہیں یہ بیل

غرض یہ کہ شاعری جوہر صاحب کو وراثت میں ملی ہے۔ اسکول اور کالج کی زندگی نے ان کے ذوق میں نکھار پیدا کیا۔ ان کی زبان سادہ، لہجہ آسانی سے سمجھ میں آنے والا ہے جسے فکر کی اڑان نے غزل، نظم دوہا وغیرہ کا روپ دیا ہے۔ آج جب کہ اردو زبان سیکھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہو رہی ہے وہاں جوہر کا یہ جذبہ دوسروں کے لئے نمونہ ہے۔ ان کا یہ مجموعۂ کلام ''ترانۂ بیداری'' جو اردو اور دیوناگری دونوں زبانوں پر مشتمل ہے انتہائی خوبصورت، دیدہ زیب، قیمتی کاغذ و جلد کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ اتنی اچھی شاعری کے لئے جوہر صاحب انتہائی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ان کی شاعری قابلِ قدر ہے۔ اس خوبصورت کتاب کی اشاعت کے لئے جوہر صاحب کے ساتھ ساتھ معروف شاعر و ادیب اور اردو کے جانباز سپاہی جناب رفعت سروش اور ان کا ''نورنگ کتاب گھر'' بھی قابلِ مبارک باد ہیں جن کی خصوصی دلچسپی سے یہ کتاب شائع ہو سکی ہے۔ یقیناً یہ کتاب اردو ہندی دونوں حلقۂ ہائے ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

OO

Dr. Mujahid Faraz
107-C6, Asalatpura, Moradabad-244001 (U. P.)
Phone : 0591-2321481

''ترانۂ بیداری''

(اردو، ہندی شعری مجموعہ)

ڈیمائی سائز کے دوسو بہتر صفحات پر مشتمل بی ایس جین جوہر کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ اس شعری مجموعہ اردو، ہندی کی طباعت پر بڑی محنت صرف کی گئی ہے۔ ''ترانۂ بیداری'' چار حصّوں میں منقسم ہے ۱۹ غزلیں، ۳۱ نظمیں، ۳۷ قطعات اور ۳ دوہے شامل ہیں۔

مشہور و معروف ادیب و شاعر جناب رفعت سروش کا مضمون خود کتاب کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ جوہر صاحب کی شاعری قدیم اندازِ سخن کے غالب عناصر کے ساتھ ان کی انفرادی آواز بھی رکھتی ہے۔ جوہر کا ذہن بلندی کی طرف پرواز کرنے کی صلاحیت اور جرأت رکھتا ہے۔ جگہ جگہ اچھے اشعار متاثر کرتے ہیں۔ ''ترانۂ بیداری'' میں جوہر صاحب نے زندگی کے ان جذبوں کی پہچان کو اولیت دی ہے جن سے واقعی زندگی، توانائی حاصل کرتی ہے۔ یہ جذبہ انسانی اقدار کو زندہ رکھتے ہیں اور دراصل یہی زندگی کا حاصل بھی ہے۔

جوہر کی شاعری، ذات و کائنات کے رشتوں کو استوار کرتی ہے اور زندگی کی اتھاہ سچائیوں کی تلاش میں سرگرداں ہے جن میں جذبوں کی تہذیب اور زندگی کا احترام بھی شامل ہے۔ جوہر نے جو کچھ روز و شب کو زندگی میں برتا ہے یا محسوس کیا ہے، اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ اسے روایت کے امکانات کی توسیع کہہ سکتے ہیں۔

جوہر صاحب کی نظمیں ان کے سیاسی و تاریخی مطالعہ کا نچوڑ ہیں۔ انہوں نے اپنے ارد گرد کا جائزہ، ذہانت اور گہرائی سے لیا ہے۔ ان نظموں میں وہ حق گو انسان دکھائی دیتے ہیں۔

جوہر کی جتنی پابند نظمیں ہیں ان میں انقلابی، آزادی اور رومانی انداز میں کہی گئی ہیں جیسے درسِ آدمیت، ترانۂ بیداری، فطرت کا پجاری، مذہب، وفا کی دیوی، نجمہ سے، تم جاؤ گی صبح سویرے، آؤ تو سہی، بن کی پریت وغیرہ طویل نظمیں ہیں۔ نظموں کے حوالے سے جناب رفعت سروش رقم طراز ہیں.....

''جوہر صاحب کے شعر نے اس وقت آنکھ کھولی جب ہندوستان غلامی کے زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس لئے آزادی کی تڑپ ان کے اشعار کی رگوں میں موجزن ہے اور انکا سفر ''ترانۂ بیداری'' سے شروع ہوتا ہے۔ وہ غلام قوم کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔ نہایت سادہ زبان میں جو بچہ بچہ کی سمجھ میں آسکے۔''

جوہر صاحب کی کئی نظمیں پڑھ کر اختر شیرانی، وامق جونپوری، مجاز لکھنوی، سلام مچھلی شہری کی نظموں کی یاد تازہ ہوگئی اور پھر سے پڑھنے کی خواہش پیدا ہوگئی۔

جوہر صاحب کی غزلوں میں جذبات کی پاکیزگی، خیال کی ندرت اور شائستگی کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔ اردو غزل کا تو یہ کمال رہا ہے کہ ایک لفظ کے ردوبدل سے شعر عشق حقیقی کی دنیا سے اٹھ کر عشقِ مجازی کا عکاس بن جاتا ہے۔ غزلوں کے سلسلے میں جناب رفعت سروش نے جوہر صاحب کی رومانی غزلوں کو ان الفاظ سے نوازا ہے.....

''عشق کے تجربات کا رنگ ان کی غزل میں جگہ جگہ نظر آتا ہے اور دلی کیفیت کو بے کم وکاست بیان کرنے کا فن ان کا حصہ ہے۔''

جوہر صاحب کی شاعری میں علامہ سیماب اکبرآبادی کی فصاحت اور ذوق کی وارفتگی کا امتزاج ملتا ہے ''ترانۂ بیداری'' کے حصہ غزلیات سے چند اشعار انتخاب کے لئے درج کر رہا ہوں.....

چپ رہیں وقتِ ملاقات خفا ہوتے ہو
پوچھ لیں بھول سے حالات خفا ہوتے ہو

حسن کے پرستاں میں اک سے ایک بڑھ کر ہے
کس کو نازنیں کہئے کس کو دلربا کہئے

ساون کی رت، بہار کا موسم، اندھیری رات
رم جھم کے گیت گونج رہے ہیں، پھوار میں

کچھ التفات بھی ہو ملا دل کشی کے ساتھ
دل چاہئے تو لیجئے، دیں گے خوشی کے ساتھ

اس سے رنگ حیات نکھرا ہے
غم سے مل کر ہمیں خوشی سی ہے

گھٹا ساون کی امڈی آرہی ہے
پیامِ اشک بھر بھر لارہی ہے

روک پائے کس کو دامن تھام کر
کیسے تھا میں دامنِ قلب و جگر

OO

Athar Nayyar
Barholia, Kansi Samri,
Darbhanga-847106 (Bihar)

بی ایس جین جوہر کے مجموعۂ کلام ''ترانۂ بیداری'' سے متاثر ہو کر

چاند کے آگے بھی جلتے ہیں کہیں ننھے دئے
میں لکھوں تو کیا لکھوں پھر جین صاحب کے لئے؟

اپنے ہر شعر میں رکھ دی نرالی شاعری
نظم میں مہکائے ہیں گل، دوہا دوہا روشنی

سرنگوں موتی ہوئے، آنکھوں سے یوں آنسو بہے
زندگی بھر شاعری کے، فن سے وابستہ رہے

نرم زلفوں کو جوانی میں اداؤں سے چھوا
جب ہوئے بوڑھے تو اپنی آخرت کی، کی دعا

''حسن اور سرمایہ داری'' نظم ہے اک کہکشاں
''اے جوانی! گیت گاتی ہیں تری انگڑائیاں''

لوگ ہر ہر شعر میں پائیں گے ''جوہر'' کا سراغ
پڑھتے پڑھتے جُرءہِ دل میں جلیں گے سو چراغ

اہلِ فن واقف ہوئے ہیں آپ کے انداز سے
بزمِ شعراء محوِ حیرت آپ کی پرواز سے

○○

Vijender Singh parvaz
507/7, Jagriti Vihar, Garh Road, Meerut
M : 9412285618, 0121-2602947

تبصرے

ایک جین کا بے چین کر دینے والا مجموعہ کلام 'ترانۂ بیداری'

''ترانۂ بیداری'' اردو کے صرف شاعر نہیں بلکہ عاشق کا شعری مجموعہ، جو 'شاعر' کی عنایت سے مجھ تک پہنچا۔ اس عمر میں میری صحت و تندرستی اور سلامتی کا ضامن بنا تو نہیں کہہ سکتا لیکن اس مجموعے نے کچھ نیا خون میرے جسم میں ضرور دوڑا دیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے جسم میں دوڑنے پھرنے والا خون آنکھ سے ٹپک کر ضائع ہو چکا تھا (وہ حسرت ناک واقعہ صرف غالبؔ کے ساتھ ہوا تھا)۔ کتاب ملی تو سب سے پہلے میں نے شاعر کی تحریر'' کچھ اپنے بارے میں'' پڑھی اور یقین جانیئے اس کے دو چار جملے ہی پڑھ کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اب ایسی جاں بخش تحریریں نظر میں نہیں آتیں۔ یہ جملہ دیکھئے ''میری خاندانی زبان زبانِ اردو تھی''۔ جینؔ صاحب! اردو تو زبان ہی خاندانی ہے۔ بہر حال آپ نے ایک تیر میرے سینے پر مارا کہ ہائے ہائے۔ پچھلے چھ سات دہوں میں خاندانی زبان کتنے خاندانوں سے رسم دوست داری کی طرح اٹھ کر ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ جین صاحب نے اس زبان کو ایک محبوبہ کی طرح چاہا اور اس کی ناز برداری کا ہر بار اپنے سر آنکھوں پر لیا۔ شاید پانچویں جماعت میں تھے کہ انہیں شاعری کے اولین زینے یعنی تک بندی پر قدم رکھنے کی توفیق ہوئی اور کالج پہنچنے تک تو وہ اچھے خاصے مقبول شاعر ہو گئے تھے۔ اس زمانے کا جو شعر یعنی اپنا شعر انہوں نے کالج کے مشاعرے میں پڑھا تو غلغلہ مچ گیا۔ شعر تھا بھی اسی نوعیت کا، قافیہ پیمائی کا نمونہ ۔

ہائے وہ طفلی کی بہاریں کیا ہوئیں
جن میں میرے بچپنے کی نرم کلیاں وا ہوئیں

''نرم کلیاں'' کہہ کر جین صاحب نے امیر مینائی کا رنگ اپنا لیا، (آپ کو یاد ہوگا امیر مینائی نے باغبان کو ہدایت دی تھی کہ ہلکے رنگ کی کلیاں بھیجنا) علامہ سیماب اکبر آبادی نے بی ایس جین جوہر کو اپنے حلقۂ شاگردی میں لیتے ہوئے پیشین گوئی کی تھی کی یہ شاعر آگے چل کر دھوم مچائے گا۔ شاعر نے اس جملے کی لاج رکھنے مین اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ بی اے تک اردو زبان ان کے ساتھ رہی، اس لحاظ سے جوہر صرف کتابی شاعر نہیں نصابی شاعر بھی ہیں۔ انہیں سلامتی کی دعا دینا، میں، اگر فرض نہیں تو نفل تو سمجھتا ہی ہوں اور دعا میں اونچ نیچ کہاں ہوتی ہے؟

یہ مجموعۂ کلام حضرت رفعت سروش کے طویل و عریض مقدمے سے مزین ہے اور اس مقدمے کو میں جواں بخت کا سہرا کہہ کر ہی دم لوں گا۔ اس سہرے نے کتاب کی وقعت میں کتنا اضافہ کیا ہے اسے تولنا مشکل ہے اور یہ بات شاعر کے حق میں جاتی ہے۔ جس شاعر کو سخن شناس رفعت سروش ملے تو قابلِ ذکر اور قابلِ قدر سمجھیں۔ اس شاعر کو اور چاہئے کیا؟ اور سچ یہ ہے کہ شاعر نے اپنی نظموں کو ایسے نرم الفاظ دئے ہیں کہ مصرعے بیلے اور چنبیلی کی کلیوں کی لڑیاں بن گئے ہیں۔

مثلاً:

صبا نے آ کر کلی کلی کے رخ حسیں سے نقاب الٹ دی

اور یہ کہ۔

لطیف شبنم کی آرسی میں تمام زیور چمک رہے ہیں

صبح خیزی کی عادت ہو تو کیا کیا مصرعے ذہن میں آتے ہیں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاعر کے مصرعوں میں سجاوٹ ہے، بناوٹ نہیں ہے۔ یہ آئے ہوئے تحفے ہیں طلب کئے ہوئے زیور نہیں ہیں۔ ''آمد'' اور کسے کہتے ہیں: صبح اور صبح کے سارے جلوے، شاعر کے کلام میں بسے ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو:

شبنم کی موسیقی ہے اور بادِ سحر کے ناز
اس نغمے پر جھوم کے بدلی اٹھا رہی ہے ساز

- ومعترف کررہی ہے!

راقمِ مضمون کا مزاج ومعاملہ یہ ہے کہ بعض اشخاص باوجود تعارف وملاقات، قلب وذہن میں اپنا مکمّل نقش بنانے میں ناکام رہتے ہیں لیکن اس کے باوصف، اکثر اصحاب، اوّلیں ملاقات میں ہی دل ودماغ میں سدا کے لئے بسیرا کر لیتے ہیں۔ جوہر صاحب میرے لئے ایک ایسی ہی من موہنی شخصیت ہیں۔ جنھوں نے میرٹھ کالج کے تاریخی اولڈ ہال (منگل پانڈے سبھا گار) میں اپنی پہلی منظوم تخلیق ''ترانۂ بیداری'' کی رسم اجراء کے بعد اوّلیں ملاقات میں، میرے نہاں خانۂ دل میں جگہ بنالی۔ شروع میں تو وہ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے مجھ سے سنجیدہ اور محتاط گفتگو کرتے رہے، اپنی شعری، نجی اور ادبی کارگذاریوں بطورِ خاص، اپنی شعری تگ وتاز اور قلمی نگارشات کے رسائل وجرائد میں شائع ہونے کے ذکر تک ہی محدود رہے۔ ''ترانۂ بیداری'' کے منصہۂ شہود میں آنے کے بعد، خلافِ توقع، ہند وپاک کے سنجیدہ اور سربرآوردہ قلمکاروں کے حوصلہ افزا تأثرات، تبصرے اور تحسینی مکتوبات کی وصولیابی سے ان کا شوقِ شعروادب اور ذوقِ علم وکتب مزید مہمیز ہوا۔ اس سلسلے میں وہ علمی، ادبی، نثری اور شعری مسائل ومعاملات میں مخلصانہ مشاورت کے لئے میرے غریب خانے پر بھی گاہے گاہے آنے لگے اور گھنٹوں میرے ساتھ محوِ گفتگو رہتے۔ ان کے ذوقِ شعری اور شوقِ سخنوری نے مجھے بتدریج ان کے اس قدر قریب کر دیا کہ وہ اب میرے مخلص ومخصوص احباب میں شمار ہونے لگے ہیں۔ ان نشستوں، ملاقاتوں اور باتوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ میں نے ان کے فن اور شخصیت سے متعلق مضامین، مکتوبات، مراسلات، تأثرات اور تبصروں کو یکجا کر کے ایک کتاب مرتّب کرنے کا عندیہ، موصوف سے ظاہر کیا۔ وہ میرے اس مخلصانہ، مشفقانہ، ناقدانہ اور برادرانہ، مشورے سے نہ صرف مسرور ہوئے بلکہ فی الفور حامی بھی بھرلی۔ اس طرح ان کی شخصیت اور فنِ شاعری پر یہ کتاب، مرتّب کرنے کا قرعۂ فال میرے نام نکلا اور میں اس کام میں سنجیدگی سے منہمک ہوگیا۔

جوہر صاحب، اخلاق، مذاق، مزاج اور معیار کے اعتبار سے آدمی نہیں، انسان ہیں۔

جین صاحب سے پوچھنا پڑے گا کہ آپ صبح کتنے بجے اٹھ جاتے ہیں یا صبح کے انتظار میں سوتے ہی نہیں ہیں اور جو شاعر غزل نہیں کہتا، پرانے لوگ اسے شاعر ماننے سے انکار کر دیتے ہیں اور میں تو پرانوں سے بھی زیادہ پرانا ہوں۔ غالبؔ نے سہلِ ممتنع کے کچھ شعر کہہ کر شاید یہ سوچ لیا ہو کہ اب سہلِ ممتنع کے شعر کون کہے گا؟ سہلِ ممتنع، سہلِ ممنوعہ نہیں ہے۔ جین صاحب نے اپنے اشعار سے یہی ثابت کیا ہے.....

غم بھلایا تو یہ محسوس ہوا
زندگی میں کوئی کمی سی ہے

بات غیروں سے تو ہنس ہنس کے کیا کرتے ہو
ہم سے ہوتے ہی ملاقات خفا ہوتے ہو

جسے سب محبت سے مل کر مناتے
کوئی ایک ایسا بھی تہوار ہوتا

اچھے شعر کی ایک تعریف یہ بھی کہی گئی ہے کہ اچھا شعر وہ ہوتا ہے جو زبان پر چڑھ جائے اور اردو کے اشعار میں یہ خوبی خاندانی معلوم ہوتی ہے۔

میری مبارک باد اس لئے کہ بی ایس جین جوہرؔ کو قدرت نے شاعری کے جوہر سے نوازا اور یہ بونس نہیں اصل کمائی ہے۔

○○

Yusuf Nazim
19, Al-Hilal, Bandra Reclemation, Mumbai-50
Ph : 022-2642128

فطری، رومانی اور مسائلی فضا میں سانس لینے والے شاعر بی ایس جین جوہر اردو کے طالب علم رہے ہیں۔ آٹھویں کلاس سے شعر کہہ رہے ہیں۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کی شاگردی اختیار کی اور بی اے کرنے کے بعد کاروباری زندگی اختیار کی لیکن شاعری ان کے مزاج کا حصہ رہی، آج بھی وہ شعر کہہ رہے ہیں۔ ''ترانۂ بیداری'' میں نظمیں، غزلیں، قطعات اور دوہے شامل ہیں۔ اس کتاب کی اردو تحریروں کو دیوناگری رسم الخط میں ساتھ ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ بی ایس جین جوہر کی نظموں میں ہندوستان کی تہذیبی قدریں ملتی ہیں۔ مناظر فطرت کی مصوری ملتی ہے اور رومانی تجربے کی کیفیت کی خوشگواری ملتی ہے۔ غزلوں میں قومی اور سماجی مسائل کے ساتھ قلبی کیفیات، تعلقی فریم ورک اور عصری تناظر کے موضوعات ملتے ہیں اور قطعات اور دوہے میں نفسیاتی جبلت اور حیاتی محرکات ملتے ہیں۔ جین جوہر کے کلام میں اخلاقی اور اقداری فیصلے نہیں ہیں بلکہ شئے کی اہمیت اور تصور اور تاثر ہے۔

شرمیلی انکھڑیوں پہ وہ بیداریوں کا ہار
سارے بدن پہ چھایا ہوا نیند کا خمار
سب لٹ گئی وہ میرے خیالوں کی کائنات
شاما اڑا کے لے گئی رنگینیِ حیات
تری رخصتی کے رتھ پر جو گرائے ہم نے آنسو
وہ دعاؤں کے دیئے ہیں انہیں عمر بھر جلانا

آدمی کو یہ کیا ہنسائے گی
زندگی خود ٹریجڈی سی ہے
نہ ہندو نہ مسلم کا یوں خون بہتا
گر انسان مذہب سے بیزار ہوتا

جین جوہر کی شاعری میں جذبے کی صداقت اور احساس کی شگفتگی ملتی ہے۔

(مطبوعہ ماہنامہ 'زاویہ' سویڈن، جنوری 2006)

OO

Dr. Manazir Ashiq Harganvi
Kohsar, Bhikan Pur-3, Bhagalpur - 812001 (Bihar)
Phone : 0641-2423633

○ محمد ایوب واقف

ترانۂ بیداری: گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ تصنیف

بی ایس جین جوہرؔ جیسے شعرا کی شاعری اور اردو زبان کے ساتھ ان ہمہ وقت لگاؤ سے اس امر کا پختہ ثبوت فراہم ہوتا رہتا ہے کہ اردو زبان کا تعلق کبھی بھی صرف مسلمانوں سے نہیں رہا ہے بلکہ اس کارواں میں ہر مذہب اور ہر فرقے کے افراد شامل رہے ہیں۔ ''ترانۂ بیداری'' اور اس کے لائق مصنف اس سلسلۂ دلنواز کی دل کش کڑی ہیں۔ میں اپنے مطالعے کی رو سے ''ترانۂ بیداری'' کو نہایت دلچسپ، اہم اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ کتاب تسلیم کرتا ہوں۔ میں نے ''ترانۂ بیداری'' کو اردو شاعری کا اہم شعری مجموعہ قرار دیا ہے۔ یقین کیجئے یہ بات میں نے یوں ہی نہیں کہہ دی ہے بلکہ اس کتاب کے مشمولات کا سنجیدہ مطالعہ کرنے کے بعد پوری ذمہ داری کے ساتھ اس بات کو نوکِ خامہ پر لا رہا ہوں۔ میری طرح دوسرے لوگ جو اس شعری مجموعہ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کریں گے وہ بھی اسی طرح کی رائے قائم کریں گے۔

دو سو بہتر صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعہ میں جوہرؔ صاحب نے انیس نظمیں، اکتیس غزلیں، کچھ قطعات اور چند دوپے پیش کئے ہیں۔ زیرِ تبصرہ مجموعے میں ۱۹۴۳ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک کہی ہوئی نظمیں شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جوہرؔ صاحب کے پاس ابھی ایسی بے شمار نظمیں ہوں گی جن کا منصۂ شہود پر آنا باقی ہے۔ غزلوں کے نیچے ان کے وجود میں آنے کے سنین نہیں دئے ہیں اس لئے ان کے بارے میں یہ پتا نہیں چل رہا ہے کہ ان کی مدتِ تخلیق کیا ہے۔ بہر حال اس شعری مجموعے مین جتنی تخلیقات ہیں ان کی روشنی میں جناب بی ایس جین جوہرؔ کی

شاعرانہ صفات اوران کی فنی صلاحیتوں کا جائزہ آسانی سے لیا جاسکتا ہے۔

راقم الحرف کے نزدیک اچھی شاعری کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے اچھی اور دل کو بھانے والی شاعری زبان و بیان کے اعتبار سے نقائص سے پاک وصاف ہوا کرتی ہے۔ شاعری تو خداداد عطیہ ہوا کرتی ہے، شاعر کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس خداداد عطیہ کو شستہ و پختہ زبان اور تعمیری قسم کے غور وفکر سے سجا اور سنوار کر قرطاس پر پیش کر دیتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہورہی ہے کہ جناب جوہر کو شاعرانہ صلاحیت قدرت کی طرف سے پوری فیاضی کے ساتھ ودیعت کی گئی ہے اور قدرت کی اس عطا کردہ صلاحیت سے انہوں نے پورا پورا کام لیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں.....

ترا حسن کافرانہ، مرا عشق والہانہ
نہ تجھے خبر تھی اپنی، نہ مرا کوئی ٹھکانہ

حسیں مناظر، جواں مسافر، نہ فکرِ منزل، نہ ذکرِ ساحل
فنا کے سیلاب نے جو گھیرا، تو شاخساروں کو ڈھونڈتا ہوں

غنچوں کو سکھاؤں گا رونا، بلبل کی فغان و زاری پر
ہر موجِ تبسم میں پیدا اک درد کا جلوہ کرلوں گا

غم بھلایا تو یہ ہوا محسوس
زندگی میں کوئی کمی سی ہے
زندگی یوں تو گزر جائے گی
کتنا مشکل یہ سفر لگتا ہے

جن اشعار کا ہم نے حوالہ دیا ہے ان میں غزل کے اچھے اشعار کا حسن و کیف اور کس بل بھی موجود ہے نیز یہ کہ شاعر کا ذہن غزل گوئی سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ چوں کہ انہیں علامہ سیماب اکبرآبادی سے شرفِ تلمذ حاصل رہ چکا ہے اس لئے انہیں شاعری کے محاسن و معائب

کا پورا علم ہے۔ ''ترانۂ بیداری''، ''مذہب''، ''وفا کی دیوی''، ''درسِ آدمیت''، ''الوداع اے وطن''، ''حسن اور سرمایہ داری''، ''نجمہ سے''، ''تم جاؤ گی صبح سویرے'' اور ''سریندر پرکاش جی کے نام'' وغیرہ میں کامیاب نظم گوئی کے سارے اوصاف موجود ہیں۔ ان نظموں میں اشارے اور کنائے میں حسنِ فطرت، انقلابی لے، رومانی کیفیت اور انسانیت و شرافت کی جوت بہت خوبصورتی کے ساتھ جگائی گئی ہے۔ تلمیحات اور استعارات کا استعمال بھی خوب سے خوب تر کی کی مثال پیش کرتا ہے۔ بہر حال کتاب صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے بہت خوب ہے۔ کتاب کے شروع میں ادیب و شاعر جناب رفعت سروش کا مضمون جوہر شناسی کے لئے بہت موزوں ہے۔ ہندی اور اردو رسم الخطوں میں ایک ساتھ شائع ہونے والی یہ کتاب اردو کے شعری سرمائے میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

(مطبوعہ ہفت روزہ ''ہماری زباں''، نئی دہلی)

OO

Mohd. Ayyub Waquif
Mangal Ashish 'B', Flat No.43, 4th Floor, Sector No.12,
Koperkhairane, New Mumbai-400709
Phone : 022-27549759

جناب بی ایس جین جوہرؔ کی بابت قلبی اور قلمی احساسات رقم کرتے ہوئے توازن اور اعتدال برقرار رکھنا اسی قدر دشوار ہے جس قدر عالمِ شباب میں شوریدسری کو لگام دینا دشوار ہوا کرتا ہے۔ جوہرؔ صاحب کی عمر اور شاعرانہ جولانی ایک دوسرے کے کبھی ہم نفس، ہمنوا، کبھی ہمراز اور کبھی ضد نظر آتے ہیں۔ جوہرؔ صاحب کے والدِ محترم نے نوجوانی میں شاعری کو بطور پیشہ اپنانے سے جوہرؔ صاحب کو روک کر ان کے حق میں یقیناً مفید فیصلہ کیا ہوگا مگر اردو شاعری کے ساتھ جس قدر ناانصافی اور حق تلفی ہوئی اس کا اندازہ لگانا کم از کم ہمارے لئے دشوار ہے.....

ے

عارض و گل کے ماہتاب کھلے
کچھ تو سچ مچ ہی لاجواب کھلے
صبح کی دھوپ میں گلاب کھلے
زلف کے سائے میں شباب کھلے

اندازہ لگائیے جوہرؔ صاحب کی شگفتہ بیانی اور رومانی اڑان کا۔ اردو شاعری اس طرز کے اشعار اور تخیل کو اب اسی طرح ترس رہی ہے جس طرح اردو زبان و ادب کی معراج کے دنوں کو ترسا جا رہا ہے.....

ہندو مسلماں دونوں کو مجبور تماشا کرلوں گا
میں دیر و حرم کے پتھر سے ایک جلوہ پیدا کرلوں گا
آزادی کے نغمے گا کر مُردوں کو جگاؤں گا اک دن
آواز میں اپنی میں پیدا اعجازِ مسیحا کرلوں گا

اللہ اللہ کس قدر جوش، جذبہ اور اعتماد کی دولت سے مالا مال ہے یہ شاعری۔ کوئی استاد شاعر ہی اس طرح کی پختہ کلامی اور وسیع المشربی کو عام کر سکتا ہے.....

؎ اس کے منھ سے جو بددعا نکلی
میرے دکھ کی وہی دوا نکلی
جس کی میّت میں تھے ہزاروں لوگ
زندگی اس کی بے مزا نکلی

ڈھونڈئے، تلاشئے اور جستجو کے سارے دفتر کھنگال ماریئے! اردو شاعری میں کم از کم جدید اردو شاعری مین اسی طرح کی سلاست اور بندش ناپید ہو چکی ہے۔ لفظ ناپید، ہم نے سوچ سمجھ کر اور پوری ایمانداری سے برتا ہے وگرنہ کون بد بخت ہوگا جو اپنے گلشن کو باغ باغ دیکھنا نہ چاہتا ہو....

؎ مذہب کے ترانے کیا چھیڑوں، مذہب کے زمانے بیت گئے
اب ایٹم بم کے دن آئے مرکب کے زمانے بیت گئے
ہر چیز پہ جدّت چھائی ہے، ہر چیز ہے اپ ٹو ڈیٹ یہاں
لیڈر کی پجاری ہے دنیا، راہب کے زمانے بیت گئے

شعری پیرائے میں جس عریاں حقیقت کو جین جوہر صاحب نے بیان فرمایا ہے کیا کوئی صحیح الدماغ آدمی اس سے انکار کر سکتا ہے! ہرگز نہیں.....

؎ ہوسِ عیش نے حیوان بنائے رکھا
لذتِ درد سے انجان بنائے رکھا
کچھ غمِ شدّتِ احساس کی چابک دستی
کچھ تری یاد نے، انسان بنائے رکھا

حقیقت کو حقیقت کے آئینے میں دیکھنا، پرکھنا اور اس کو پیرایۂ شعر میں ڈھالنا ہر شخص کی خواہش ہوا کرتی ہے مگر جو دردمندی، سچائی اور فنی کمال جین جوہر صاحب کے یہاں جوبن دکھلا رہا

ہے وہ کم از کم آج کے شعراء میں ناپید نہ سہی خال خال ضرور ہے۔ اسی جوبن، اسی سخن کا کمالِ لازوال کو جس قدر نمایاں اور عام کیا جائے اسی قدر اردو زبان اور اردو شاعری کو دوام ملے گا اور جین جوہر صاحب کو کم از کم یہ اطمینان ضرور ہوگا کہ جس زبان، جس ادب اور شاعری کو انہوں نے اپنی عمر کی ساٹھ بہاریں اور سیکڑوں ہزاروں قیمتی لمحات سونپے ہیں اسی زبان، ادب اور شاعری کے متوالوں نے اس کو رائگاں نہیں ہونے دیا۔ بے شک جین جوہر صاحب کہیں.....

؎ زندگی جی چکے ہیں ہم اپنی
عمر اب رہ گئی ہے کم اپنی
وقت پڑنے پہ کام آئے گی
گانٹھ میں باندھ لیں رقم اپنی

یہ احساس جین صاحب کے بجائے اردو ادب و شاعری کے ہر طالبِ علم، ناقد اور شائق کا ہونا چاہئے کہ جس قدر جلد ممکن ہو ہمیں جین جوہر صاحب کے شعری ورثے کو نہ صرف سنبھال لینا چاہئے بلکہ جین جوہر صاحب کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے نفیس احساسات اور نفیس خیالات کو شاعری کے جامے میں جین جوہر صاحب کی مانند دردمندی اور دلکشی سے پیش کریں بلکہ اسے اس طرح عام کریں کہ پڑھنے والے کو اسی طرح ذہنی بالیدگی اور قلبی اطمینان ہو جس طرح جین جوہر صاحب کے کلام کے مطالعے کی روشنی میں ہوتا ہے۔ ہمارے لئے جین جوہر صاحب کی شاعری، زندگی کی زندہ حقیقتوں کو جانچنے، پرکھنے اور زیست کا چلن ہموار رکھنے کا ذریعہ ہے۔ بقول جین جوہر صاحب.....

؎ وفا کے ساز پہ گاتا ہوں نغمے زندگانی کے
مری آواز، آوازِ دو عالم ہوتی جاتی ہے

خدا کرے حریت پسندوں کی سرزمین میرٹھ کی یہ مضبوط اور توانا آواز تادیر اپنے احساس و جذبات سے اردو ادب اور میرٹھ کی ادبی فضاؤں کو گرماتی اور برماتی رہے جس کے زیرِ اثر

میرٹھ سے دور بسنے والے بھی خود کو زیادہ معتبر اور زیادہ ثروت مند محسوس کر سکیں۔ پروفیسر خالد حسین خاں نے صحیح فیصلہ کیا کہ جوہؔر صاحب جیسے جوہر یگانہ کے فن اور شخصیت پر ایک گراں قدر کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کیا۔ میں پروفیسر خالد حسین خاں اور جوہؔر صاحب دونوں کو ہی اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

OO

گلزار جاوید
(مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ ''چہارسو'' راولپنڈی، پاکستان)
Phone : 92-51-5462495, 5467235
e-mail : waqars_ano@yahoo.com

یہ خوش گفتار اور خوش اطوار بھی ہیں۔ عمر کی ۷۸ بہاریں دیکھنے کے بعد بھی یہ چاق و چوبند ہیں، مناسب جسم اور میانہ قد، بھرا بھرا متبسم چہرا، اونچی پیشانی، سر پر سلیقے سے سجے سنورے بال، نکھرا نکھرا گندمی رنگ، روشن آنکھیں، ان کی ذہانت کا پتہ دیتی ہیں۔ متانت، نفاست، لطافت، شہامت، شرافت، شائستگی اور شوخی کا امتزاج ان کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ مسکراتے بھی ہیں اور اکثر قہقہے بھی لگاتے ہیں تاہم ناگواری یا بداطواری کا احساس نہیں ہوتا، یہ ان کی زندہ دلی اور خوش طبعی کا عکاس بھی ہے۔

جوہر صاحب دُھن کے پکّے اور کام کے سچّے ہیں، وہ جب بھی کوئی کام اپنے ذمّہ لیتے ہیں تو اس کو پورا کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ مثلاً پہلے اپنے تعلیمی مراحل سر کئے، پھر تجارتی منازل حل کئے اور اس کے بعد اب شعری مسائل میں سرخ رو ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عمل پیہم اور کاوشِ ہر دم کے قائل ہیں، حقیقت پسندی ان کے مزاج کا شعار ہے۔ اداروں، انجمنوں، ادبی مافیاؤں اور اردو کے خود ساختہ ناخداؤں سے ان کا ربط وضبط نہیں ہے، وہ ایمانداری اور انفرادی کو ششوں کو کامیابی کی ضمانت سمجھتے ہیں۔ اس کے باوصف، جوہر صاحب صائب الرائے اور خالص عملی انسان ہیں علمی، ادبی، شعری، مجلسی یا مذہبی مرحلے ہوں یا زندگی کے عمومی مسائل و معاملات، یہ اپنی ایک مخصوص رائے رکھتے ہیں، خوبی یہ کہ اپنی رائے سے اختلاف کرنے والوں کو وہ برا نہیں کہتے اور نہ برا گردانتے ہیں اور نہ ہی انہیں عقل و دانش میں اپنے سے کم تر تصوّر کرتے ہیں، کیونکہ ان کا یہ خیال مبنی برحق ہے کہ رائے کا اختلاف لعنت نہیں بلکہ نعمت ہے، زحمت نہیں بلکہ رحمت ہے۔ جوہر صاحب کی ایک اور خوبی نے مجھے متأثر کیا ہے یعنی وہ اپنے مخلص احباب کو دولت، شہرت، عزت، قابلیت اور عہدے کے فیتوں سے نہیں ناپتے بلکہ وہ دوست کو انسان تصوّر کرتے اور انسان کو انسان کا دوست ہونے پر ہی پختہ یقین رکھتے ہیں۔ ان کی بے ریا اور بے لوث شخصیت نہ صرف اپنے حلیفوں بلکہ ادبی و شعری حریفوں کے معاملے میں بھی ایک جیسی ہے، ان کا دل گداختہ سب کے لئے جذبۂ خیر سگالی رکھتا ہے! جوہر صاحب کے یہاں ''دین و دنیا'' یا دَھرم و دَھرتی'' دونوں

علاّمہ سیمابؔ اکبرآبادی کی شعری فیوض و برکات برصغیر کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے امر ہونے ہونے والی یوپی، بھارت کے شہر میرٹھ میں بی ایس جین جوہرؔ کے نام سے کم و بیش ساٹھ پینسٹھ برس سے علامہ کی روشن کردہ سخنی شمع بڑی آب و تاب سے روشن بھی ہے اور تاباں بھی، جناب بی ایس جین جوہرؔ نے اردو شاعری کو کل وقتی مصروفیت کے طور پر اپنایا ہوتا تو ان کا شمار برصغیر ہند و پاک کے ان بلند قامت شعراء کی فہرست میں نمایاں مقام حاصل ہوتا جنہوں نے جنگِ آزادی میں قلمی جہاد کے ذریعہ ہراول دستے کا فریضہ انجام دیا بلکہ اردو غزل کے گیسو سنوارنے میں بھی پیش پیش رہے۔ ہمارے پیشِ نظر جناب جوہرؔ کا تازہ شعری شمارہ ''ترانۂ بیداری'' ہے۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ تمام مجموعہ ہو بہو نقل کر کے آپ کے اعلیٰ ذوق کی سند حاصل کریں۔ دقّت درپیش قلّت صفحات کی ہے جس کے خوف سے آپ کے روبرو ان کے کلام سے چند قاشِ شیریں پیش کر کے آپ کی توجہ جوہرؔ صاحب کے بامعنی و بااثر کلام کی جانب مبذول کرانا چاہیں گے.....

ہائے وہ ایّامِ طفلی کی بہاریں کیا ہوئیں
جن میں میرے بچپن کی نرم کلیاں وا ہوئیں

اگر آدمی کچھ سمجھدار ہوتا
تو دنیا میں بس پیار ہی پیار ہوتا
مصیبت میں کوئی مددگار ہوتا
تو جینا بھی اتنا نہ دشوار ہوتا

ترا حسن کافرانہ، مرا عشق والہانہ
نہ تجھے خبر تھی اپنی، نہ مرا کوئی ٹھکانہ
ہمیں پر نگاہ رکھنا، ہمیں سے نظر چرانا
وہ بہ انتہائے قربت بھی سلوک عامیانہ

تمام تر کوششوں کے باوجود جناب جوہر کے کلام سے ہم کوئی نظمی نمونہ پیش کرنے سے معذور ہیں کہ ہر نظم ایک شاہکار اور پورے جوبن و جوانی کے ساتھ آپ سے ہم آغوش ہونا چاہتی ہے جس کے لئے ہماری اور مدیر ''چہارسو'' کی محدودات آڑے آرہی ہیں۔ البتہ شاعری اور دوسرا جنم کے عنوان سے دو قطعات ہم ضرور آپ کی نذر کرنا چاہیں گے.....

ذہن میں میکدہ خیالی ہے
ہاتھ میں جام ہے نہ پیالی ہے
ہم نے بس زندگی کے مٹکوں میں
شاعری کی شراب ڈھالی ہے

زندگی کتنی بے وفا نکلی
موت کی وہ بھی آشنا نکلی
کرکے ہم کو سپردِ خاک و کفن
گھر کسی غیر کے وہ جا نکلی

''ترانۂ بیداری'' کی خاص اور اہم خوبی اس کا اردو اور دیوناگری میں ایک ساتھ شائع ہونا بھی ہے جس کے باعث کتاب کی ضخامت دوسو بہتر (۲۷۲) صفحات کو چھو رہی ہے۔ قیمت بھی مناسب اور دستیابی بھی ممکن ہے۔

مطبوعہ ''چہارسو'' راولپنڈی، (پاکستان) جلد ۱۵، شمارہ مئی و جون ۲۰۰۶ء

OO

بی ایس جین جوہر کی غزل کا یہ شعر.....

نہ جانے کن گناہوں کی سزا ہے زندگی میری
ہزاروں آفتیں ایسی کی ہر آفت پہ دم نکلے ء

مرزا غالب کے مصرعے کا خوب توڑ نکالا ہے اور پھر.....

خبردار اے جہاں والو، قیامت آنے والی ہے
کہاں جائے گی دنیا، گر خدا کے گھر بھی بم نکلے

بی ایس جین جوہر کا کلام ''ترانۂ بیداری'' بے حد سلیس اور خوبصورت ہے، مخمور سعیدی کی یاد تازہ ہوگئی۔ وہ بھی کچھ اسی طرح سادگی اور ندرت سے اپنی بات شعر میں ڈھال دیتے ہیں۔ جوہر صاحب کو بھی اسی چابکدستی سے اپنی بات کہنے میں مہارت حاصل ہے۔ صاف و شفاف طور سے.....

اگر آدمی کچھ سمجھدار ہوتا
تو دنیا میں بس پیار ہی پیار ہوتا
مصیبت میں کوئی مددگار ہوتا
تو جینا بھی اتنا نہ دشوار ہوتا

اور..... زندگی کتنی بے وفا نکلی
موت کی وہ بھی آشنا نکلی
کرکے ہم کو سپردِ خاک وکفن
گھر کسی غیر کے وہ جا نکلی

مطبوعہ ''چہارسو'' راولپنڈی، (پاکستان) جلد ۱۵، شمارہ مئی و جون ۲۰۰۶ء

○○

جوہر بحیثیت شاعر: مختصر جائزہ

کہتے ہیں پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔ بی ایس جین جوہر اردو شاعری کے ایسے ہی ایک پوت ہیں جن کے پاؤں کا اندازہ ان کے اساتذہ نے اسی وقت جب کہ پرائمری کلاسز کے پالنے میں زیرِ تعلیم تھے، لگایا تھا اور یقین ہو گیا تھا کہ یہ پوت اپنے پیروں کے بل بوتے پر جلدی دوڑ لگانے لگے گا اور بڑی ادبی فتوحات کرے گا۔ اس لئے اسکول کے اساتذہ جوہر کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

جوہر کو شاعری کا ذوق وراثت میں ملا تھا، قدرت نے موزونی طبع بھی عطا کی تھی۔ ابتدائی درجوں میں ہی آپ کو صحیح شعر کہنے کی صلاحیت حاصل ہو گئی تھی۔ چودہ برس کی کم عمری میں بھی آپ نے ایک کالج کے مشاعرے میں ایک نظم ''ایامِ طفلی'' سنا کر مشاعرہ لوٹ لیا تھا جس کا ایک شعر ہے ۔

ہائے وہ ایامِ طفلی کی بہاریں کیا ہوئیں
جن میں میرے بچپنے کی نرم کلیاں وا ہوئیں

جوہر کی طبیعت میں شاعری کا سیلاب امنڈتا دیکھ کر ان کے والد کو خطرہ محسوس ہوا کہ خاندان کا چشم و چراغ مبادا شاعری کے طوفان میں غرق ہو جائے۔ انہوں نے شاعری کی راہ پر چلنے سے سختی سے منع کر دیا اور جوہر نے والدین کے حکم کے آگے سرِ خم تسلیم کر دیا لیکن جو پیدائشی شاعر ہو اس کے قلم پر کون بندش لگا سکتا ہے۔ آپ کا کاغذ قلم سے رشتہ ہمیشہ استوار رہا۔ صرف عملی

طور پر کلام کے نشر واشاعت سے گریزاں رہے۔

آپ بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعے میں ۱۸ نظمیں، ۳۱ غزلیں اور ۳۷ قطعات اور ۱۲ دوہے شامل ہیں جو آپ کے کمالِ فن کی دلیل ہیں۔ تمام نظمیں ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء کی یعنی سولہ سترہ سال کی عمر میں کہی ہوئی لیکن پختگی طبع کی مثال ہیں۔ غزلوں اور دوسری اصناف پر سنِ تخلیق درج نہیں ہے لیکن یہ سب اس کے بعد کی ہی ہونا چاہئے۔ آپ کو سیمابؔ اکبر آبادی نے اپنی شاگردی میں بخوشی قبول کیا تھا اور کچھ کلام پر اصلاح بھی دی تھی۔ کاروباری کامیاب زندگی سے سبک دوشی کی منزل پر پہنچ کر آپ نے اپنے کلام کی اشاعت کی طرف توجہ دی ہے۔

آپ کی نظموں، غزلوں پر حبِّ وطن اور عصری مسائل کی جھلک ہے۔ مذہب کو دنیا کے انسانوں کے بیچ بنائے مخاصمت مانتے ہیں، اس لئے مذہب بیزاری بھی جھلکتی ہے۔

''ترانۂ بیداری'' کی تخلیقات اردو کے ساتھ آمنے سامنے دیوناگری میں بھی ہیں اس لئے ہندی داں طبقے کے لئے بھی اس کی افادیت ہے۔

جناب رفعت سروش کے پیش لفظ کے ساتھ دونوں رسم الخط میں یہ کتاب ۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ عمدہ کاغذ، طباعت، کمپوزنگ اور خوبصورت جلد و سرورق کو دیکھتے ہوئے قیمت مناسب ہے۔

○○

Kausar Siddiqui
Editor : Quartely 'Karwan-e-Adab'
Zeb Vila, 79-A, Ginnori Main Road, Bhopal-462001 (M. P.)
Phone : 2542731

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

''ترانۂ بیداری''، بی ایس جین جوہر کا مجموعۂ کلام ہے جس میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ جوہر پیشہ ور شاعر نہیں ہیں۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ ملک کے جس دور سے ان کا تعلق ہے اس میں شاعری رومانیت اور عشقیہ شاعری سے فاصلہ بناتی ہوئی دکھائی دیتی ہے حالانکہ جمالیاتی اور رومانی پہلوؤں کے پس پردہ جوہر نے معاشرہ کا تجزیہ کیا ہے۔ دنیا میں سامراجیت کے خلاف جو بے چینی تھی اس کا عکس ان کی شاعری پر ہے۔ سامراجیت اور جاگیردارانہ نظام سے پیدا شدہ حالات نے جس قدر مایوسی کے تانے بانے بنے تھے اس کشمکش سے پورا سماج گزر رہا تھا۔ ان کا حساس دل جب یہ محسوس کرنے لگا کہ سامراجیت اور جاگیردارانہ نظام ملک کی عوام کو ہر اعتبار سے پامال کر رہا ہے تو ذہن میں ابھرتے ہوئے تمام فکری خاکے اس طرح شعری قالب میں ڈھلنے لگے گویا یہ ان کی ہی آپ بیتی ہے۔ سامراجیت کے پنجہ نے پورے سماج کو جکڑ رکھا تھا اور اس کی بنیادیں ہل چکی تھیں لیکن کس وبل باقی تھا۔ جوہر نے اس درد کو محسوس کیا تھا۔ ان مناظر کو دیکھا تھا اور حالت سے گزرے تھے جس میں انسانی قدریں پامال ہو چکی تھیں۔ یہ روایات کے پاسدار تھے، اپنی تہذیبی وراثت کو بچانا چاہتے تھے۔ ان کا ذہن اور فکر بے چین تھا اور ذہن وفکر کی اسی بے چینی کے نتیجہ میں ان کے اندر کا شاعر ابھرنے لگا گرچہ ان کی زندگی میں تجارت کا عمل دخل تھا لیکن اندر کا شاعر محض تجارتی حساب کتاب سے مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ زندگی کے لئے معاشی واقتصادی حصول یابی ہی کافی نہیں تھی۔ روحانی وقلبی سکون بھی ضروری تھا اور جب تک ان سارے لوازمات کو دبائے رکھتے وہ مضطرب رہتے۔ شاعری کا وسیلۂ اظہار انکو وراثت میں ملا تھا جسے اپنا کر انہوں نے نہ صرف اردو کی خدمت کی بلکہ تاریخ کے اس اہم موڑ کی کڑی بن گئے جسے جاننے کے لئے ماہر تاریخ بھی ان کے کلام سے استفادہ کر سکتا ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں.....

ترا حسن کافرانہ، مرا عشق والہانہ
نہ تجھے خبر تھی اپنی، نہ مرا کوئی ٹھکانہ
تری رخصتی کے رتھ پر جو گرائے ہم نے آنسو
وہ دعاؤں کے دیئے ہیں انہیں عمر بھر جلانا
ساون کی رُت، بہار کا موسم، اندھیری رات
رم جھم کے گیت گونج رہے ہیں پھوار میں
آزادی کے نغمے گا کر مردوں کو جگاؤں گا اک دن
آواز میں اپنی میں پیدا اعجازِ مسیحا کرلوں گا
حسن کی حفاظت کے انتظام ادھورے ہیں
پھول لٹ گئے کانٹوں کو یہ بے وفا کہیئے
محبت سکھانے پیمبر نہ آتے
ہر اک شخص دھرتی پہ اوتار ہوتا

ان کی شاعری میں لطیف اور خوش نما الفاظ سلیقے سے پروئے گئے ہیں۔ اردو شاعری کی روایت سے ان کی وابستگی کا اندازہ بھی ان کی شاعری سے ہوتا ہے۔ لفظوں کے انتخاب میں کسی میکانیکی عمل کو بروئے کار لایا نہیں گیا ہے۔ شاعری کو اکتسابی عمل نہیں سمجھا بلکہ وجدانی کیفیت میں جو اشعار نازل ہوئے اسے شاعری کا روپ دیا۔ ان کا یہ کارنامہ اردو شاعری میں گراں قدر اضافہ ہے۔ ان کی نظمیں ''ترانۂ بیداری''، ''اوشا''، ''فطرت کا پجاری''، ''درسِ آدمیت''، ''ترا حسن کافرانہ، مرا عشق والہانہ'' اپنے اندر ایک خاص کیفیت رکھتی ہے۔

(مطبوعہ سہ ماہی ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ)

OO

Dr. Imam Azam
Editor : Tamseel-E-Nau (Quartely)
Qila Ghat, Darbhanga (Bihar)
Mobile : 09431085816

''ترانۂ بیداری'' ایک ایسے شاعر کا شعری مجموعہ ہے۔ جس نے اپنی ابتدائی شاعری ہی سے بڑے بڑے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا اور علامہ سیمابؔ اکبرآبادی نے پیشین گوئی کی تھی کہ تم بڑے ہوکر ہندوستان میں بہت شہرت حاصل کروگے لیکن کاروبار سنبھالتے ہی وہ شعر و ادب کی دنیا سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ لیکن بقول کسی کے کہ اندر کا شاعر کبھی نہیں مرتا برسوں کی خاموشی کے بعد بی ایس جین جوہرؔ اپنے بھرپور اعتماد کے ساتھ پھر ادبی دنیا میں آئے ہیں لیکن ان کی شاعری خاص طور پر نظمیں، ایسی پائے کی ہیں کہ ایک سال کے اندر ہی اندر پوری ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ یہی نہیں اپنے پہلے شعری انتخاب کو کتابی شکل میں پیش کرکے ایک ہنگامہ کردیا ہے۔ اس لئے آج کل نثری نظموں کا اتنا پھیلاؤ ہوگیا ہے کہ پابند شاعری دور دور تک نظر نہیں آتی ایسے ہی ایک پابند نظر کے شاعر ''ترانۂ بیداری'' پیش کرکے ساری دنیا کو بیدار کردیا ہے بلاشبہ ایسی نظمیں اب نہ پڑھنے کو ملتی ہیں۔ نہ دیکھنے کو جن میں اتنی روانی، تازگی اور دلوں پر اثر کرنے والی تاثیر ہے جو پڑھتا ہے، پڑھتا ہی رہ جاتا ہے.....

وفا کی دیوی

ستارے جھلملائے چاند کی کرنیں پڑیں پھیکی
گگن کے آنسوؤں سے رات کی ساری قبا بھیگی
تڑپ اٹھا فضائے حسن میں احساسِ بیداری
ستاروں نے وفورِ شوق میں ہنس کر پلک ماری
ثریا نے تو آنکھیں موند لیں کیفِ تصور میں
مگر اک کہکشاں ڈوبی ہوئی سی ہے تفکر میں

وہ اک جادو سا جو چھایا ہوا تھا بزمِ امکاں پر
فسونِ نور و ظلمت جو مسلط تھا شبستاں پر
وہ اب تحلیل ہوتا جارہا ہے صبح کی ضو سے
ابھی ہیں عارضِ گلشن بہ تاباں رات کے بوسے
سمندر کے کنارے ہے شبابِ نور کا پرتو
یہ ڈھلتی چھاؤں ہے تاروں کی یا اک حور کا پرتو
افق سے یوں اجالا سا ہویدا ہورہا ہے کیوں
کہ جیسے کوثر و تسنیم کی موجیں ہمکتی ہوں

بی ایس جین جوہر کی یہ صرف ایک نظم کے چند بند پیش کئے گئے ہیں جنہیں پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے قلم میں کتنی روانی ہے۔ زبان و بیان پر قدرت ہے۔ کون سا لفظ کہاں، کتنا فصیح ہے وہ خوب سمجھتے ہیں۔ اس لئے لفظوں کے انتخاب میں اپنی پوری توجہ صرف کرتے ہیں اور شعروں میں ایک تازگی پیدا کردیتے ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات خواہ کچھ بھی ہوں وہ بالکل سیدھے سادے انداز میں اپنی بات کہنے کے ہنر سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اندازِ بیان کو دلکشی دے کر اور بھی تاثیر پیدا کردیتے ہیں۔ ان کے یہاں لفظوں کے ساتھ کھلواڑ نہیں ہے جو کہ آج جدیدیت کے نام پر کیا جاتا ہے بلکہ ان کا کلام استادانہ ہے جس میں پختگی نمایاں ہے یہی ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ بڑے سلیقے سے دلوں میں اثر والی شاعری کے ذریعے انسانیت کا درس بھی دیتے ہیں اور قومی یکجہتی کے گیت بھی گاتے ہیں دراصل ان کی شاعری پیار و محبت، ایثار و فا خلوص کے جذبات سے لبریز ہے یہاں چند نظموں کے اقتباس پیش کرتا ہوں.....

مذہب

مذہب کے ترانے کیا چھیڑوں، مذہب کے زمانے بیت گئے
اب ایٹم بم کے دن آئے، مرکب کے زمانے بیت گئے

بی۔ایس۔جین جوہر

فن اور شخصیت

مرتب:

ڈاکٹر خالد حسین خاں

صدر شعبۂ اردو، میرٹھ کالج، میرٹھ

پہلو متوازی حیثیت رکھتے ہیں، یعنی ان کے یہاں ''دین ودھرم'' اصولِ حیات ہے تو ''دھرتی یا دنیا'' طرزِ حیات! اور یہ ان دونوں راستوں کے کامیاب راہی ہیں! ان کی گفتگو بظاہر سادہ، بباطن، پر کار ہوتی ہے، اسی کے ساتھ اسلوبِ بیان میں موصوف کی عمرِ رفتہ کے تجربات، مشاہدات، معاملات اور انسانی نفسیات کی گہرائی و گیرائی بھی غضب کی ہوتی ہے، ان کا لب ولہجہ نرم وسبک ہوتا ہے، یہ اپنی شبنمی وشیریں گفتگو سے مخاطب کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں! یہ اپنے مخصوص وشائستہ اندازِ بیان میں مذہب، ثقافت، سیاست، عصری ادب ونظریات اور شاعری پر بے تکان و بے تکلف گفتگو کرتے ہیں۔ اردو، ہندی، فارسی اور انگریزی شاعری اور ان سے وابستہ معروف شعراء کے چنندہ اشعار ان کو ازبر ہیں، یہ وصف، اس حقیقت کا غماز ہے کہ ان کا حافظہ پیرانہ سالی کے باوصف، قابلِ رشک ہے اور لطف یہ کہ وہ اپنے حافظے کا برمحل استعمال بھی خوب جانتے ہیں!! ان کی نظر و پکڑ نظم ونثر دونوں پر یکساں ہے لیکن ان کی رغبت وشہرت ان کی شاعری کی بدولت ہے۔

میری نگاہ میں، جوہر صاحب بحیثیت انسان بھی نا قابلِ فراموش ہیں۔ ان کے یہاں توازن، تواضع اور تہذیب کے عناصر ثلاثہ کی کیفیت نمایاں ہے، ان کی مقبولیت محبوبیت اور دلنوازیت کے اہم اسباب یہی عناصر ہیں، ان کے دلِ مصفّٰی میں کذب کدورت، تعصّب، تفاخر، نفرت ونفاق کا گذر نہیں، اس کے برخلاف، جگر کی طرح، ان کا پیغام ''محبت'' ہے، جسے انہوں نے اپنی شاعری، اپنے اقوال، اپنے اعمال اور اپنے کردار کے وسیلے سے، پیغام انسانیت، پیغام محبت اور پیغام اُخوت کا کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات وزبان سے کبھی کسی شریف اور بے لوث شخص وشاعر کو تکلیف وصدمہ نہیں پہنچا ہے! ایسے ہی ظرف وذوق سے متصّف افراد کے لئے میرے محبِّ خاص، مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کا یہ شعر بخوبی چسپاں ہوتا ہے۔

دلوں پر نقش ہو جاؤ گے اِک دن ابھی کاغذ پہ تم پھیلے ہوئے ہو

جوہر صاحب کسی ادبی تحریک، گروہ، انجمن اور ادارے سے منسلک نہیں ہیں، یعنی یہ

ہر چیز پہ جدت چھائی ہے، ہر چیز ہے اپ ٹو ڈیٹ یہاں
لیڈر کی پجاری ہے دنیا، مذہب کے زمانے بیت گئے
مذہب کے ترانے کیا چھیڑوں، مذہب کے زمانے بیت گئے

اس نظم میں شاعر نے دنیا کے ظلم وستم، سیاست کے اتار چڑھاؤ اور انسانیت، محبت مذہب کو یاد کرتے ہوئے خون کے آنسو بہائے ہیں کہ کس طرح آج ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کر رہا ہے کہ خون انسان اتنا سستا ہو گیا ہے کہ اس کی کوئی قیمت ہی نہیں رہی۔ ''ترانۂ بیدری'' میں اس طرح کی کئی نظمیں ہیں جن میں انسانیت کے جذبات کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فطرت کے پجاری، درسِ آدمیت، الوداع اے وطن، برہ کا گیت، معذرت، پیامِ شوق بہت خوبصورت نظمیں ہیں۔ جہاں صرف ایک طرف ان کی بہترین نظمیں ہیں وہیں ان کی منتخب غزلیں بھی شامل ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ''ترانۂ بیداری'' ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں ہے جس سے ان کی شاعری دونوں حلقوں میں نہ صرف پڑھی جائے گی بلکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے گی۔ اس کتاب کا دیباچہ بی ایس جین جوہر صاحب کے دوست مشہور و معروف شاعر رفعت سروش نے لکھا ہے جس میں ان کی شاعری پر کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔

(مطبوعہ سہ ماہی ''انتساب'' سرونج)

OO

Saifi Saronji
Chief Editor : Intisab
Saifi Library, Saronj-824464 (M. P.)
M : 09300782056

○ سعید اختر اعظمی

غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے مسائل سے آگاہی کے ساتھ تسکینِ ذوق بھی شاعری کے لئے ضروری ہے۔ شاعر کو وہی کچھ کہنا چاہئے جو دل اور دانشوری کا تقاضہ ہو۔ اردو کے ماحول میں پروان چڑھنے والے بی ایس جین جوہؔر نے اس پر مہرِ اثبات لگاتے ہوئے نعرے بازی اور اکہری شاعری کی روش سے انحراف کو اپنا شعار بنایا۔ دیگر شعرا کی طرح حسن ان کے لئے بھی متاثر کن رہا ہے جس کے لئے فراق و وصال، حسرت و ناامید اور زمانے کے جور و ستم کے بیان میں انہوں نے تصوراتی کیفیت کے بجائے تجرباتی کیفیت کو ترجیح دی۔ افلاطونی رنگ کے بجائے محبت ان کے یہاں لطیف اشاروں اور کنایوں کی مرہونِ منّت ہے۔

جوہؔر کے اولین مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' میں انقلاب اور رومان نئے رنگ و آہنگ میں ہے۔ آزادی کی جوت جگانے والی نظم ''ترانۂ بیداری'' کے بعد ''محبت کس طرح کروں''، ''اوشا''، ''وفا کی دیوی''، ''حسن اور سرمایہ داری''، ''بن کی پریت''، ''نجمہ سے''، ''تم جاؤ گی صبح سویرے''، ''آؤ تو سہی''، ''...... کے خط کے جواب میں''، ''خوابوں کے ویرانے''، ''برہ کا گیت'' اور ''نجمہ'' کے مختلف حوالوں سے رومان سامنے آتا ہے۔ ''مذہب اور فطرت کا پجاری'' میں انہوں نے درسِ آدمیت کے ساتھ نظامِ عالم کو بدلنے کی بات کی ہے تو ''الوداع اے وطن'' میں قصرِ محکومی کی بنیادیں ہلا دینے کے درپے، ''جوان کی آخری سانسوں کے سفر میں طلسم شب''، ''دریا''، ''موجوں کا غبار'' اور ''منور ظلمتوں کی معنویت'' کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

جوہؔر نظم کے مقابلے میں غزل کو توسیعی حوالے فراہم کرنے سے قاصر ہیں پھر بھی کہیں کہیں ان کے اشعار چونکا دینے والے ضرور ہیں......

لوگ خوشیاں تو بانٹ لیتے ہیں
غم کی دولت ہی کچھ نجی سی ہے

بڑھ گئی رونقِ در و دیوار
جب سے گھر میں نقوشِ آب کھلے

مدتوں دیر و حرم کے لوگ سکتے میں رہے
جب بھی دیکھا ہے تو محوِ یاد دیکھا ہے مجھے

عہدِ ماضی کے فسانے ہی سنالیں تم کو
اتنی خاموش کوئی رات کبھی ہو کہ نہ ہو

رفعت سروش کے جامع پیش لفظ سے آراستہ مجموعے میں قطعات متوجہ کرنے والے ہیں۔ البتہ شاعری میں جابجا، اتم اِچھا، پاتی، سندر سکھ، لال کرن، پٹ رانی اور نیر کی ہندی اصطلاحات مناسب نہیں لگتیں۔ اردو کے ساتھ دیوناگری رسم الخط میں اس مجموعے کی اشاعت اردو رسم الخط سے نابلد حضرات کے لئے ایک کامیاب کوشش ہے۔ جس کے لئے بی ایس جین جوہر دادو تحسین کے مستحق ہیں۔

مطبوعہ ہفت روزہ "اخبارِ نو"، نئی دہلی
اگست 2005

OO

○ سہیل انجم

آج کے دور میں جب کہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان بنانے کی پوری پوری کوشش جاری ہے، بی ایس جین جوہر جیسے لوگ بڑے غنیمت ہیں جو اس کوشش اور سازش کے راستے میں ناقابلِ عبور دیوار بن کر کھڑے ہیں۔ جب تک ایسے لوگ موجود ہیں اردو کے دامن پر فرقہ واریت کا داغ نہیں لگ سکتا اور اس پر صرف مسلمانوں کی زبان ہونے کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا حالانکہ آنجناب نہ تو کسی کالج میں لیکچرار ہیں اور نہ ہی کسی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو یا اردو کے پروفیسر ہیں۔ اس کے باوجود اردو کی زلف گرہ گیر کے دیوانے ہیں، اردو کے پرستار ہیں۔ وہ اردو کی روٹی نہیں کھاتے مگر پھر بھی اس کے عاشقِ زار ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں..... ''میری خاندانی زبان اردو ہے''..... جب تک اردو کے ایسے بے لوث خادم اور ایسے عاشق صادق موجود رہیں گے اردو کو کوئی مٹا نہیں سکے گا اور لاکھ زیادتیوں کے باوجود اردو زبان فنا نہیں ہو سکے گی۔

بی ایس جین جوہر نے تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے خاندانی کاروبار میں ہاتھ بٹایا اور اس کو آگے بڑھایا لیکن تجارتی مصروفیات کے باوجود انہوں نے اپنے اس شوق کو مرنے نہیں دیا جو بچپن ہی میں ظاہر ہو گیا تھا اور جس نے ان سے پانچویں جماعت سے ہی جب کہ ان کی عمر بمشکل بارہ سال تھی، شعر گوئی کروادی تھی۔ اس شوق کو انہوں نے ختم نہیں ہونے دیا جس نے ان کو اردو میں اچھی استعداد پیدا کرنے میں مدد دی اور جس کی بدولت آٹھویں کلاس میں ہی ان کا کلام اس وقت کے معروف میگزین ''تیج'' (ہفتہ وار) میں شائع ہونے لگا۔ اس وقت یہ آٹھویں کلاس میں جین کالج، بڑوت میں پڑھتے تھے مگر میگزین کے مدیران کے کلام سے متاثر ہو کر انہیں جین

کالج کا استاد سمجھ لیا گیا اور ان کا نام بطور پروفیسر شائع ہونے لگا۔

بی ایس جین جوہر نے علامہ سیماب اکبر آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور سیماب اکبر آبادی نے برسوں تک ان کو اپنا شاگرد بنائے رکھا۔ انہوں نے ان سے کہا تھا ..... ''صاحب زادے اگر تمہارا ذوق اسی طرح برقرار رہا تو ایک روز ہندوستان کے نامور شعرا میں تمہارا نام ہوسکتا ہے''..... لیکن شاید یہ ان کی قسمت میں نہیں لکھا تھا اس لئے جب ان کے والد کو علم ہوا کہ ان کا بیٹا شاعری کر رہا ہے تو انہوں نے حوصلہ شکنی کی حالانکہ وہ خود اردو کے اچھے عالم اور سخن فہم تھے لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا خاندانی تجارت سے دور ہو جائے اور شاعری اختیار کرے لہٰذا انہوں نے جوہر کے نام ایک طویل خط لکھا اور کہا..... ''تم جس راہ پر چل رہے ہو اس سے تمہارا وہی حشر ہوگا جو اردو کے ہر شاعر کا ہوتا ہے یعنی فاقہ مستی اور گھر والوں کا تو بس بھگوان ہی مالک ہے''..... جوہر صاحب نے سعادت مندی کے ساتھ خاندانی تجارت کو ذریعہ معاش کے طور پر اختیار کر لیا لیکن شاعری کے ساتھ ان کی دیوانگی کم نہیں ہوئی اور یہ راتوں کو چھپ چھپ کر شعر گوئی کرنے لگے۔

لیکن تجارتی مصروفیات نے ان کو اپنا کوئی مجموعہ شائع کرنے کی فرصت ہی نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۹ء سے شاعری کے باوجود انکا پہلا شعری مجموعہ اب منظرِ عام پر آیا ہے جس میں ان کے ۶۶ برسوں کے شعری سرمائے کا انتخاب موجود ہے۔ اس مجموعہ میں جو پہلی نظم ہے اس کا عنوان ''ترانۂ بیداری'' ۱۹۴۴ء میں لکھی گئی ہے اور اسی کے نام پر مجموعہ کا نام بھی رکھا گیا ہے۔ اس نظم میں ملک کے نوجوانوں کو آواز لگائی گئی ہے کہ ان میں جو حوصلہ ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا.....

جاگ اٹھو اے سونے والو
سب کچھ پاکر کھونے والو
خلوت کی تاریک فضا میں

اشکوں سے منھ دھونے والو
تم نے اپنی قدر نہ جانی

اس انتخاب میں مختلف قسم کا شعری مزاج ملے گا اور الگ الگ وقتوں میں کی جانے والی الگ الگ رنگ کی شاعری کے نمونے بھی ملیں گے۔ اس میں جگر مرادآبادی اور خمار بارہ بنکوی کا رنگ دکھائی دے گا۔ فیض احمد فیض کی سوچ بھی ملے گی اور فراق کا شعری آہنگ بھی نظر آئے گا۔ ''محبت کس طرح کروں'' ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر نے دل کے تمام زخموں کو کھول کر رکھ دیا ہے اور ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' کے انداز میں سوال کیا ہے کہ بتاؤ تو سہی تم سے محبت کس طرح کروں؟

نظر میں کانپتا ہے اک جہنم زار کا منظر
تخیل کے شبستاں میں دلِ بیدار کا منظر
لرزتے ہیں نگاہوں میں پرخچے زندگانی کے
ہیں خاک وخون میں لتھڑی ہوئی لاشوں کے پشتارے
فضائیں دہر کی برسا رہی ہیں سرخ انگارے
بتاؤ تو سہی تم سے محبت کس طرح کر لوں

''درسِ آدمیت'' کے عنوان سے ایک نظم ہے جس میں انسانوں کی محتاجگیوں اور مجبوریوں پر آنسو بہائے گئے ہیں۔ جنگ کے خلاف بھی آواز بلند کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ایک بند.....

جنگ کے سائے میں کس طرح سے رہتے ہیں غریب
کچھ فسانے غم و آلام کے کہتے ہیں غریب
کیسے کیسے وہ مصائب ہیں جو سہتے ہیں غریب
ہائے افلاس کے سیلاب میں بہتے ہیں غریب

ان کی حالت تو ذرا دیکھ کہ ہے باعثِ ننگ
سیکڑوں آدمی پھرتے ہیں یہاں ننگ دھڑنگ

ان کی درد انگیز نظموں کی مانند ان کی رومانی نظمیں بھی بہت متاثر کن ہیں اور ان میں جو تجربات دکھائی دیتے ہیں وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان میں غمِ فراق بھی ہے، امید و وصل بھی ہے، اظہارِ حسرت بھی ہے اور زمانے کے جور و ستم بھی ہیں۔ اس کے باوجود شاعر اپنی رومانی نظموں کو رومانی ہی رہنے دیتا ہے۔ دنیاوی پریشانیوں اور دشواریوں کو اپنے جذبات پر حاوی نہیں ہونے دیتا۔

بی ایس جین جوہر کی غزلیں ہمیں آمادہ کرتی ہیں کہ ہم ان کو بار بار پڑھیں۔ ان کی بعض غزلوں میں زبان کی لذت اور شیرینی، استاد شعرا کی یاد دلاتی ہے۔ مثال کے طور پر.....

میری ہر بات پہ بے بات خفا ہوتے ہو
جانے کیا بات ہے دن رات خفا ہوتے ہو
وفا کے ساز پہ گاتا ہوں نغمے زندگانی کے
مری آواز، آوازِ دوعالم ہوتی جاتی ہے
جوانی اٹھ رہی ہے اور نظر مائل ہے جھکنے پر
یہ کیسی کشمکش سی ان میں پیہم ہوتی جاتی ہے
یوں ہی ربط و ضبط الفت میں ہے باہمی کشاکش
مجھے ہو نہ ہو شکایت انہیں سیکڑوں گلے ہیں
نہ چھیڑو میرے دل کا ساز مضراب وفا تم سے
فریبِ بے کسی حسن سے انجان رہنے دو

ایسے بہت سے اشعار ہیں جس کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے لیکن میں ان سے گریز کرتا ہوں۔ مجموعہ کے شروع میں رفعت سروش نے ''بی ایس جین جوہر کی شاعری'' کے عنوان

سے ایک بسیط مقالہ لکھا ہے جس میں شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ رفعت سروش نے ان کے بارے میں بہت خوب لکھا ہے :

> ''جوہر صاحب ان چند شاعروں میں ہیں جنہوں نے اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے شعر کہے۔ وہ ناقدوں کی پروان چڑھائی ہوئی تحریکوں سے اپنا دامن بچا کر وہی کہتے رہے جو ان کے دل میں اور دانشوری کا تقاضہ تھا۔''

جوہر صاحب نے اس مجموعہ کو دونوں زبانوں اردو اور ہندی میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوا کہ جوہر صاحب نے اردو والوں کے ساتھ ناانصافی کی۔ انصاف کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ان کے اب تک کئی مجموعے منظر عام پر آ جانے چاہئے تھے لیکن شاید یہ پہلا مجموعہ ہے اور کہنا پڑے گا کہ یہ بہت تاخیر کے ساتھ یعنی 78 سال کی عمر میں منظر عام پر آیا ہے۔ بہر حال دیر آید، درست آید کے مصداق سخن فہم حضرات ان کا خیر مقدم کریں گے اور ان کی صلہ وستائش کی تمنا سے بے نیاز شاعری کی پذیرائی کریں گے۔ آخر میں ہم بھی وہی کہیں جو مڈل اسکول کے ان کے اساتذہ کہا کرتے تھے ''اللہ کرے ذوقِ سخن اور زیادہ''۔

مطبوعہ ''بیان الکتاب'' قومی آواز، سنڈے ایڈیشن، مورخہ 7راگست 2005

OO

Suhail Anjum
New Delhi

کئی مہینہ ہوگئے، آپ کی فرستادہ ''ترانۂ بیداری'' کی ایک جلد موصول ہوئی تھی۔ سراپا سپاس ہوں کہ آپ نے خاکسار کو اس کرم کے لائق جانا اور اتنے گراں قدر ادبی تحفہ سے نوازا۔ پہلے سوچا تھا کہ فوراً ہی شکریہ کا خط لکھوں مگر پھر خیال آیا کہ ایک نظر کتاب پر ڈالنے کے بعد ہی شکریہ ادا کروں گا لیکن جب کتاب کھولی تو اس نے خود کو حرف بہ حرف پڑھوانا شروع کیا۔ کتاب دھیرے دھیرے، مزہ لے لے کر پڑھی اور ہر نظم پڑھنے کے بعد کچھ سوچنے پر مجبور ہوتا رہا۔ اب کتاب ختم کر کے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اردو شعری ادب کو مالا مال کرنے میں جہاں میرؔ و غالبؔ جیسے نامور شعراء کا ہاتھ رہا ہے وہاں آپ جیسے تقریباً گم نام شعراء کا بھی بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

آپ کے کلام میں احساس کی شدت تو ہے ہی مگر اس احساس کو جس سادگی سے بغیر کسی تصنع کے آپ نے خوبصورت اور فوراً ہی متاثر کرنے والے الفاظ میں بیان کیا ہے، وہ آپ کو بحیثیت شاعر کے الگ پہچان دیتا ہے۔ چاہے وہ ''ترانۂ بیداری'' ہو یا ''مذہب''، ''فطرت کا پجاری'' ہو یا کوئی اور نظم..... ہر تخلیق ایک مقصد رکھتی ہے اور اس مقصد اور اس کے پیچھے اس کے اظہار کے پیچھے حسّاس شاعر کی مثبت اور تعمیری سوچ ہے۔ کہیں براہِ راست اور کہیں بالواسطہ شاعر نے ایک ایسے سماج، ایک ایسی نئی دنیا کا خواب دیکھا ہے جس میں امن ہو، شانتی ہو، اخوت ہو، رواداری ہو، جنگ و جدل، فساد، نامساوات اور دورِ حاضر میں اعلیٰ قدروں کی پامالی شاعر کو ایذا پہنچاتی ہے، بے چین کرتی ہے اور اس کا قلم ان کے خلاف اپنا مخصوص شعری احتجاج درج کرانے لگتا ہے۔ ہر نظم افادی، ہر غزل کامیاب..... بہت بہت مبارک باد۔ اللہ آپ کو اچھا رکھے۔

○○

Iqbal Ansari
F-176, Pandav Nagar, Delhi-91
Ph: 22751532

''ترانۂ بیداری''، بی، ایس، جین جوہر کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں نظمیں، غزلیں، قطعات اور دوہے شامل ہیں۔ جوہر ان شعرا میں ہیں جو محض اپنی ادبی ذوق کی تسکین کے لئے شعر کہتے ہیں اور جن کے یہاں فن کی عظمت اور احترام پایا جاتا ہے۔ ان کا کلام گزشتہ نصف صدی پر محیط ہے جس کے مطالعے سے شاعر کے ذہنی اور فنی ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے۔

جوہر نے جب آنکھ کھولی تو اس وقت ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ چنانچہ وقت کے تقاضے کے پیشِ نظر انہوں نے اپنی نظموں میں حب الوطنی کے ترانے گائے اور ملک وقوم کے خوابیدہ لوگوں کو جگانے کے لئے اپنی پہلی نظم ''ترانۂ بیداری'' لکھی.....

جاگ اٹھو اے سونے والو!
سب کچھ پاکر کھونے والو!
خلوت کی تاریک فضا میں
اشکوں سے منھ دھونے والو!
تم نے اپنی قدر نہ جانی

جوہر نے اپنی شاعری کی ابتدا حب الوطنی کے موضوعات سے کی لیکن وہ بنیادی طور پر ''حسن کے شیدا اور فطرت کے پجاری'' ہیں۔ ان کی نظموں میں حسن وعشق کے ترانے اور معاملات، عشق کا بیان ملتا ہے جو اردو شاعری کا خاص حصّہ ہے۔ ''محبت کس طرح کرلوں''، ''وفا کی دیوی''، ''بن کی پریت''، ''نجمہ سے''، ''تم جاؤ گی صبح سویرے''، ''آؤ تو سہی''، ''خوابوں کے ویرانے''، ''برہ کا گیت'' وغیرہ نظمیں اسی قبیل کی ہیں:

اپنے ہی بل پر، اپنے ہی زر پر اور اپنے ہی طرز پر، گذشتہ چھ دہوں سے اردو شاعری اور فروغِ اردو کے لئے خاموشی سے مُنہمک رہے ہیں۔ شاعری میں یہ صحت مند روایت و رجحان اور کلاسیکی اقدار و افکار کے حامل و حامی ہیں، گویا، یہ بھرپور اعتماد، مضبوط اعتقاد اور مربوط اجتہاد کی فضا میں زندگی بسر کرنے کے عادی رہے ہیں!! یہ میرٹھ کے موجودہ شاعروں میں غالباً سب سے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر ہیں، ان کے ہم عمر صرف مضطر نگینوی ہی حیات ہیں لیکن ان کی نسبت نگینہ سے ہے، بہرکیف! جوہر صاحب، بیسویں صدی کے اوائل سے فنِ شاعری کی پر پیچ راہوں پر گامزن ہیں، ان کی شاعری میں ہر طرح کا مال دستیاب ہے، بالفاظِ دگر، ان کے بازارِ سخن میں کسی بھی شئے کی کمی نہیں ہے، یہ ضرور ہے کہ ان کی شعری فضا میں قدامت کا رنگ و روغن نمایاں ہے تاہم اسی کے ساتھ ساتھ لطف و لذت کا وہ تمام سامان بھی موجود ہے جو آج سے پانچ دہوں قبل، اس عہد کی سماجی، سیاسی، اخلاقی، انسانی اور معاشی فضا کا خاصہ تھا، جوہر صاحب اپنی زندگی و زمانے کے جس دور سے بھی گذرے، اپنی چشمِ بینا کو کھلا اور سماعت و حسیات کو بیدار رکھا اور ہر نوع کے تازہ جھونکوں کو اپنے قلب و ذہن میں بے محابا اور بے جھجک داخل ہونے دیا! جوہر صاحب جوانی و جنون کی دھوپ چھاؤں سے بعافیت اور بہ سلامت نکل آئے ہیں، ان کی بزرگی اب، شکرِ الٰہی، تجارتِ موروثی میں محصور ہونے کے علاوہ شعری و علمی سرگرمیوں کے لئے بھی وقف ہے!

جوہر صاحب ایک فرّاخ دل، گداز قلب اور بلند اخلاق انسان ہیں، اس دورِ کشاکش میں یہ عمومی اردو مافیاؤں اور سازشی شاعروں سے بہت دور، مکر و فریب سے ناآشنا، ادبی جوڑ توڑ سے ناواقف، متین اور سنجیدہ شخص ہیں، اسی سبب بلا امتیاز، یہ ہر طبقہ اور ہر مکتبِ فکر میں یکساں مقبول و محترم ہیں اور ان کی یہی خوبیاں، محبوبیاں مجھے بے حد عزیز ہیں! جوہر صاحب میرے حلقۂ احباب میں ایک معمّر دوست اور مخلص سخنور ہیں، ان کی صفات گوناگوں ہیں، میرا ذاتی خیال و تجربہ ہے کہ جہاں یہ دل کے کھرے، بات کے کھرے اور زبان کے بھی کھرے ہیں، وہیں ان کی سرشت میں جینن مسلک کی سادگی، شانتی، شائستگی، شیرینی، شفافیت اور سبھیتا بھی ہے۔

ابھی تک اس کے رخساروں پہ وہ بوسے ترستے ہیں
سہاگن عورتوں کے جن کی خاطر دل ترستے ہیں
دو شعلے کی سی نوکیلی نگاہیں ساتھ رہتی ہیں
جو گردن سے لپٹتی تھیں وہ باہیں ساتھ رہتی ہیں

(وفا کی دیوی)

نویدِ عیش و مسرت سنائے گا اب کون
میرے خیال کی دنیا بسائے گا اب کون
بہائیں گی کبھی آنسو حسین برساتیں
تیرے خیال میں سسکیں گی چاندنی راتیں
ترا تصورِ رنگیں مجھے رلائے گا
خیال ساحلِ جمنا پہ کھینچ لائے گا
اٹھائیں گی جہاں موجیں ستارے نجمہ
اے میری جانِ عزیز

(نجمہ سے)

جوہر بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے غزلیں بھی عمدہ کہی ہیں جس میں مترنم بحریں، مانوس لب ولہجہ اور آسان لفظوں میں معاملاتِ عشق اور وارداتِ قلبی کا بیان ہے.....

ترا حسن کا فرانہ میرا عشق والہانہ
نہ تجھے خبر تھی اپنی نہ مرا کوئی ٹھکانہ
تری رخصتی کے رتھ پر جو گرائے ہم نے آنسو
وہ دعاؤں کے دیئے ہیں انہیں عمر بھر جلانا
جانے پھر تم سے ملاقات کبھی ہو کہ نہ ہو
کھل کے دکھ درد کی کچھ بات کبھی ہو کہ نہ ہو

جو جلاتے ہیں مرے غم کے اندھیروں میں چراغ
میرے ہاتھوں میں وہی ہاتھ کبھی ہو کہ ہو

جوہر نے نظموں اور غزلوں کے علاوہ دوہے اور قطعات بھی کہے ہیں اور یہ تمام اصناف موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان پر کسی ایک شاعر کا بیک وقت قادر ہونا ایک خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ بوقلمونی اور پختگی یقیناً سیماب اکبرآبادی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔

پری زار:

نقش کچھ اتنے سلونے ہیں پری زاروں میں
گھر بنالیتے ہیں جو ذہن کی دیواروں میں
حسن نسلوں کی امانت ہے حفاظت کے لئے
یوں تو لٹتا بھی ہے، بکتا بھی ہے بازاروں میں

غرض کہ ''ترانۂ بیداری'' ایک گلدستہ ہے جس میں ہر طرح کے پھول ہیں۔ امید ہے کہ حلقۂ احباب میں یہ مجموعہ لوگوں کو متوجہ کرے گا۔

OO

Abdur Rahman
34, Peeryar Hostel, Jawahar Lal Nehru University,
New Delhi

''ترانۂ بیداری'' بی ایس جین جوہر کا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے کہ جین صاحب کی خوبصورت شاعری کے تعلق سے کچھ کہا جائے، جی چاہتا ہے کہ خود بی ایس جین جوہر صاحب کا مختصر سا تعارف ہو جائے..... جین صاحب کی پیدائش مئی ۱۹۲۷ء میں، میرٹھ کے ایک قصبے ''امین نگر سرائے'' کے ایک متمول خاندان میں ہوئی۔ آپ کی خاندانی زبان اردو ہے۔ جین صاحب کے والد بھی اردو کی اچھی قابلیت رکھتے تھے اور شعر کا ذوق بھی تھا۔ انہوں نے ۱۲ سال کی عمر سے ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ آپ کے اساتذہ نے آپ کی ہمت افزائی کی اور تھوڑے ہی دنوں میں آپ مشاعروں میں جانے لگے اور کلام رسائل میں چھپنے لگا۔ بعد میں جوہر صاحب نے علامہ سیماب اکبر آبادی سے اپنے کلام پر اصلاح لینا شروع کر دی۔ جب جین صاحب کی شاعری کی اطلاع ان کے والد کو ملی تو نہوں نے فوراً ایک خط بھیجا جس میں ان کو اردو شاعروں کے انجام سے خبردار کیا کہ اکثر شاعر فاقہ مستی کی زندگی گزارتے ہیں۔ شاعری ترک کرو اور روزی روزگار کا وسیلہ ڈھونڈو۔ والد صاحب کی نصیحت کا جین صاحب کے دل پر اثر ہوا۔ انہوں نے باقاعدہ مشقِ سخن تو ترک کر دی، ہاں چلتے پھرتے از خود شعر سرزد ہوتے تو ان کو نوٹ کر لیتے۔ بہ قول خود ؎

اس دل میں موجزن ہے جذبات کا سمندر
تھامے نہیں تھمیں گی ایسی روانیاں ہیں

بی اے میں کامیاب ہونے کے بعد جین صاحب تجارت میں لگ گئے۔ انکا ایک کارخانہ ہے جس سے ان کو اچھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ ان کی بیگم ایک سگھڑ خاتون ہیں۔ جین صاحب کے فرزندان کا کاروبار دیکھتے ہیں۔ اب جین صاحب کو فارغ البالی نصیب ہوئی ہے اس

لئے وہ دوبارہ شعر و شاعری کی طرف رجوع ہو گئے ہیں۔ انہیں رفعت سروش جیسے بزرگ شاعر کی رفاقت حاصل ہے۔ کتاب میں رفعت سروش صاحب کا طویل دیباچہ بھی شامل ہے۔

بی ایس جین جوہرؔ نظم، غزل، قطعات غرض کہ ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مذہب، محبت کس طرح کرلوں، وفا کی دیوی، درسِ آدمیت، بن کی پریت اور نجمہ سے، ان کی خوبصورت نظمیں ہیں۔ جوہرؔ صاحب کی غزلیں بھی دلنشین ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر رات میں رونے والے کو آرام کی خواہش کیا جوہرؔ
سبزے کا بچھونا کافی ہے ہاتھوں کا سرہانہ کرلوں گا

نہ مندر نہ مسجد پہ تکرار ہوتی
کہ انساں کو انساں سے پیار ہوتا
جسے سب محبت سے مل کر مناتے
کوئی ایک ایسا بھی تہوار ہوتا

اس سے رنگِ حیات نکھرا ہے
غم سے مل کر ہمیں خوشی سی ہے
دل کسی اور کی امانت ہے
اس لئے اس قدر حفاظت ہے
یہ کمالِ دل کشی ہے کہ کرشمہ پرستش
میں جہاں جہاں گیا ہوں وہ وہیں وہیں ملے ہیں
غم کسی سے کہا نہیں جاتا
بن کہے بھی رہا نہیں جاتا
آج تو ایک ہی کشتی میں ہیں منجھدار میں ہم
پھر یہ مجبوریٔ حالات کبھی ہو کہ نہ ہو

کتاب کو اس طرح چھاپا گیا ہے کہ سیدھی جانب اردو رسم الخط ہے اور دوسری جانب ہندی رسم الخط۔ اس طرح امید ہے کہ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچے گی۔ کتابت، طباعت معیاری ہے۔

(مطبوعہ ماہنامہ 'سب رس'، حیدرآباد دکن)

○○

Sayed Imtiyazuddin

''ترانۂ بیداری''.....مختصر اظہارِ خیال

محترم جوہر صاحب، نسخہ ''ترانۂ بیداری'' کے لئے شکریہ۔ وہ بھی اتنی جلد کہ میرے مکتوب کی سیاہی کتاب کے حصول کے لئے ابھی سوکھی بھی نہ ہوگی اور کتاب وصول ہوگئی۔

باوجود اس کے کہ میں بیمار ہوں، بیمار چل رہا ہوں، ہارٹ، ذیابیطس، بی پی جیسے عام امراض جس کی کوئی حد نہیں ہوتی، ہر دم بہ تدریج عروج پر رہتی ہیں لیکن ادبی میلان کو روک نہیں سکتیں۔ کتاب کو پڑھا، بہ غور پڑھا.....اتنی دلچسپی سے کہ کتاب ہاتھ سے چھوٹی ہی نہیں۔

آپ کی شاعری نہایت سلیقے سے سوتوں کو جگانے والی شاعری جیسی شاعری ہے۔ کیوں نہ ہو آپ کی خاندانی زبان اردو جو ٹھہری۔ کتاب کا عنوان اور سرورق پر برگد سے چھنتی ہوئی روشنی گویا گوتم کا سا نرمان ہوا۔ جو کچھ پڑھا، کتاب میں جھنجوڑنے والا احساس ہے۔ کتاب کی تزئین وجلد بندی اتنی خوب ہے کہ دیگر خوش طبع وخوش اسلوب، جلدوں میں ''شیلف'' میں رکھی ہوئی بھی منفرد لگ رہی ہے۔ کھولو، پڑھو، تو سب سے الگ تھلگ۔ ان معنوں میں کہ دو بڑے اسلوب اردو اور ہندی اس میں دو بہنوں کی طرح قریب قریب کندھے سے کندھا ملائے کھڑی ہیں۔ اردو رسم الخط میں مقبول نہ ہو، یہ اچھا ہی ہوگا۔ اردو رسم الخط تو گولائیوں میں بٹا، قوسوں کے اندر ایک بہار ہے جسے ایک نازک اندام کہ بس دیکھتے ہی رہو دیکھتے ہی رہو اور کھول کر پڑھنے کو جی چاہے۔

آپ کی شاعری سہلِ ممتنع کے رنگ میں خوب ہے۔ ایسا رنگ، ایسا اسلوب بڑے

بڑے شعراء کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ فیضؔ ہوں کہ ساحرؔ یا مجازؔ، سبھوں نے ایسی شاعری کو اپنایا اور دلوں کو گرمایا۔ یوں کہ

ع تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

آپ کا کلام بھی دل میں اتر جانے والا ہے، جب آپ کہتے ہیں.....

ع بتاؤ تو سہی تم سے محبت کس طرح کرلوں

تو بات دل کو چھو جاتی ہے۔ روداد زمانہ پر۔

نظمیں اور ان کی پیشانیوں پر ٹنکے عنوانات کے سائن بورڈ، قاری کی توجہ فوراً اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ ہر عنوان ایک مصرعہ کی طرح ہے، ایک آہنگ لئے کلام میں جذب ہوتا جاتا ہے جیسے ایک رواں دواں ندی کا پانی چھل چھل بہتا ہے۔

'ترانۂ بیداری'' میں آپ کا یہ ترانہ بھی خوب ہے.....

مذہب کے ترانے کیا چھیڑوں، مذہب کے زمانے بیت گئے

نجمہ کو لے کر اپنے دلی جذبات کا اظہار میں آپ کا مصرعہ دل کو چھو گیا.....

تیرا یہ رشتۂ جذبات مجھ سے ٹوٹ گیا

بس اب سدا کے لئے تیرا ساتھ چھوٹ گیا

کہ تو ہے پیکر صبر و قرار اے نجمہ

اے میری جانِ عزیز

یہاں نظم کی جوانی ابھر کر آئی ہے اور ''اے مری جانِ عزیز'' کے ساتھ ''اے مری جانِ بہار'' بھی ہوتا تو تاثر اور بڑھ جاتا۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے۔ تاہم نجمہ پر آپ کی یہ نظم اول تا آخر ایک ایسی کیفیت کا سماں ہے جو آپ کے دل کو جھنجوڑ گیا ہے۔ میں نے نظم کو گجرات کی نسل کشی میں دیکھا اور پڑھا۔ گرچہ یہ نظم ۲۰/ دسمبر ۱۹۴۴ء کی لکھی ہوئی ہے لیکن لگتا ہے کہ حال کی ہی لکھی ہوئی ہے اور کسی سیاست داں کا یہ کہنا کہ احساسِ شرمندگی سے ''اب میں باہر کیا منھ لے کر جاؤں'' بجا ہے

اور آپ نے ہر ایک غزل ہو کہ نظم، اس کے نیچے تاریخ پیدائش ڈال دی ہے۔ یہ اچھا ہی کیا لیکن خوبی یہ ہے کہ خواب گذشتہ کے خیالات حال پر منطبق ہوتے نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ نظم حاصلِ کتاب لگی۔ مبارکباد قبول فرمائیں اور بھی ہیں، اور بھی آئیں گی، سفر جاری رکھئے۔ آپ میں جولانی ہے، ترنگ ہے، خیالات کی اڑان ہے اساتذہ جیسی۔

چلتے چلتے ایک نظم ''آ ؤ تو سہی'' پر بھی تبصرہ ہو جائے کہ دراصل غزل کو ''عورت سے بات چیت'' کی بات کہی گئی ہے۔ یہاں نظم میں آپ نے سلیقے سے بات کی ہے..... ''مسکراتی آ ؤ تو سہی، گنگناتی آ ؤ تو سہی''، ''کچھ پشیمان سی حیا سے نظر آ ؤ تو سہی''..... ''آنا'' کی تکرار خوب ہے۔ آخیر میں ایک اور نظم ''تم جاؤ گی صبح سویرے'' میں میرا اپنا ایک ذاتی خیال ایک شعر کے توسط سے.....

دل کا اجڑنا سہل سہی، ہنسنا لیکن سہل نہیں
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

بہر حال مجموعی طور پر ''ترانۂ بیداری'' میں آپ نے خیالات کو بیدار کر دیا ہے۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ قبول فرمایئے گا۔

OO

Zehra Mashoor
H. No. 20-3-912, Shah Gunj, Jubilee Post, Hyderabad-2
Phone : 24415713

دراصل میں نہ تو نقاد ہوں اور نہ تبصرہ نگار اور نہ ہی اس قابل کہ آپ کے کلام پر تبصرہ کرسکوں بس ایک قاری کی حیثیت سے اپنے تاثرات رقم کررہا ہوں اور اپنے پسندیدہ اشعار ذیل میں کوٹ کررہا ہوں۔ آپ کے مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' نے خوب محظوظ کیا۔ یہ کتاب آپ کے کلام سے ہی نہیں بلکہ آپ کے حالاتِ زندگی سے بھی واقف کراتی ہے۔ چونکہ یہ میرا ابتدائی دور ہے اس لئے مجھے خاص طور سے آپ کے ابتدائی حالات نے بہت متاثر کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ جب بھی بی ایس جین جوہرؔ کا ذکر ہو تو ان باتوں کا ذکر ضرور ہو کہ صرف بارہ برس کی عمر میں آپ سے ہلکے پھلکے شعر موضوع ہونے شروع ہوگئے تھے۔ جب آپ آٹھویں کلاس میں تھے تو تب آپ کا کلام اس زمانے کے مشہور رسالہ ہفت روزہ ''تیج'' میں شائع ہوتا تھا اور یہ کہ آپ علامہ سیمابؔ اکبرآبادی کے تلامذہ میں سے ایک ہیں اور علامہ سیمابؔ اکبرآبادی کی آپ کے بارے میں رائے جو انہوں نے آپ کے ابتدائی دور میں دی تھی کہ ''اگر تمہارا ذوق وشوق اسی طرح برابر بنا رہا تو ایک روز ہندوستان کے نامور شعراء میں تمہارا نام ہوسکتا ہے۔'' (یہ رائے صحیح ثابت ہوئی ہے۔)

''ترانۂ بیداری'' پڑھ کر میں محترم رفعت سروش کی آواز میں آواز ملا کر کہوں گا کہ آپ کا شمار آپ کے ہمعصروں میں ضرور ہونا چاہئے۔ یہ کام اور کوئی کرے یا نہ کرے۔ آپ کا کلام ضرور کرے گا۔ ذیل کی نظمیں دیکھئے جو ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء میں کہی گئی ہیں اور آج بھی (اس بے حس دور میں) وہی اہمیت رکھتی ہیں.....

جاگ اٹھو اے سونے والو! سب کچھ پاکر کھونے والو!
خلوت کی تاریک فضا میں اشکوں سے منھ دھونے والو!
تم نے اپنی قدر نہ جانی

دنیا کی بیدار فضا ہے　　چاروں طرف کہرام مچا ہے
لاشوں کے انبار پڑے ہیں　　دولت کا دل کانپ رہا ہے
لیکن تم ہو محوِ غلامی
پھولوں سے شادابی لے کر　　جگنو سے بیتابی لے کر
زہرہ کی ننھی شرمیلی　　آنکھوں سے بے خوابی لے کر
راہ میں اپنی بڑھتے جاؤ
ذرّے ذرّے میں جمالِ زندگی مستور ہے
سبز پیپل کے درختوں پر نزولِ نور ہے
سرمدی خاموش موسیقی قریب و دور ہے
ہنس رہی ہے رات تاروں کی سبھا مخمور ہے

آپ کا نظمیہ کلام بہت پختہ اور استادانہ ہے۔ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی اردو زبان پر بڑی مضبوط پکڑ ہے۔ اس کتاب میں جواہر کی بھرمار ہے۔ یہ شعر دیکھئے جو سالہا سال کی کڑواہٹ کو مٹھاس میں بدل دیتا ہے.....

نہ زندگی کا بھروسہ نہ موت ہی کا پتہ
گلے ملو کہ گِلے دور کرنے آیا ہوں

ویسے میں غزل کے مزاج کا آدمی ہوں مجھے آپ کی غزلیہ شاعری نے بہت متاثر کیا ہے۔ کس کس شعر کا ذکر کروں۔

ترا حسن کافرانہ، مرا عشق والہانہ
نہ تجھے خبر تھی اپنی، نہ مرا کوئی ٹھکانہ
مجھے دیکھ کر کسی کا سرِ راہ مسکرانا
یہی بات تھی ذرا سی یوں ہی بن گئی فسانہ

جوہر صاحب بحیثیت شاعر بھی لائق اعتبار کہے جا سکتے ہیں، ان کو زبان و بیان پر قدرت، اسلوبِ نگارش میں مہارت اور فنِ عروض پر گرفت حاصل ہے۔ یہ کسی بھی موضوع پر (عشق و عاشقی اور بوالہوسی کے علاوہ) بلا تکلف، بلا جھجک، گھنٹوں گفتگو کر سکتے ہیں اور ان کا اختصاص یہ بھی ہے کہ وہ اپنا نقطۂ نظر مخاطب سے منوا لیتے ہیں۔ ان کے مزاج میں متانت و فطانت اور لطافت و نفاست اس طرح رچ بس گئی ہے کہ میرے علاوہ بھی کوئی اور شخص ان سے بور نہیں ہوتا بلکہ ان کی شاعرانہ اور ساحرانہ گفتگو میں اپنے تصورات و خیالات کے لئے نئی راہیں، نئی سمتیں اور نئے اشارے پاتا ہے! جوہر صاحب نہ کسی پر بے جا وار کرتے ہیں اور نہ ہی تمسخر اڑاتے ہیں بلکہ اپنی بات، اپنا نقطۂ نظر اور اپنا مفہوم بالکل دوٹوک انداز میں دلائل و براہین کے حوالے سے بیان کرتے ہیں، ان کا لہجہ دھیما اور طرزِ تخاطب ملائم رہتا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ شعری، فنّی اور عروضی معاملات میں کسی طرح کی رورعایت پسند نہیں کرتے، یہاں وہ مردِ ملائم سے شمشیر برہنہ بن جاتے ہیں!! یہ اکثر عمومی شعرا کی طرح جوڑ توڑ نہیں کرتے، یہ کاوشوں پر یقین رکھتے ہیں، حرکتوں پر نہیں! موصوف جین مذہب کے پیروکار ضرور ہیں مگر کٹر نہیں، گرچہ یہ مسجد میں اذان تو نہیں دے سکتے لیکن مسجد میں خدا کا جلوہ ضرور دیکھ سکتے ہیں!

جوہر صاحب تن کے چلنا بھی جانتے ہیں اور جھک کے ملنا بھی، وہ کسر نفسی میں بھی طاق ہیں اور خودداری میں بھی بے باک۔ مسلسل چلتے رہنا، ان کی جبلّت ہے اور شاعری کرتے رہنا ان کی فطرت ہے ''ترانۂ بیداری'' کو اردو کے معروف ادیب و شاعر رفعت سروش نے بڑی فنکاری سے مرتّب کیا تھا اور جوہر صاحب کے فکر و فن اور شاعری پر ایک وقیع مضمون بھی سپردِ تحریر کیا تھا، جس میں جوہر صاحب کی تمام خوبیوں کو بخوبی اجاگر بھی کیا تھا، رسمِ اجراء کے معاً بعد جوہر صاحب نے جہاں تمام دیگر اصحاب کو ایک ایک نسخہ بھیجا، وہیں مجھے بھی اپنی تخلیق، اس گذارش کے ساتھ عنایت کی، کہ میں بھی اس ارمغانِ شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کروں، میں نے دو یوم کے درمیان، کتاب پر مختصر تبصرہ نما مضمون ان کو بذریعۂ ڈاک مرسل کر دیا تھا، حسنِ اتفاق، جین

تری رخصتی کے رتھ پر جو گرائے ہم نے آنسو
وہ دعاؤں کے دیئے ہیں انہیں عمر بھر جلانا

ذیل کا شعر دیکھئے، ایسا لگتا ہے کہ الفاظ آپ کے اشارے کے منتظر تھے۔ جیسے آپ نے اشارہ کیا وہ ان اشعار میں آ کر جمع ہو گئے ۔

نہ رجوع اتفاقاً، نہ گریز احتیاطاً
کوئی کر سکے نہ رسوا، کوئی دے سکے نہ طعنا
بات غیروں سے تو ہنس ہنس کے کیا کرتے ہو
ہم سے ہوتے ہی ملاقات خفا ہوتے ہو
جاتے جاتے کسی کی راہ تکی
جان بھی کتنی بے حیا نکلی
جسے سب محبت سے مل کر مناتے
کوئی ایک ایسا بھی تہوار ہوتا

درج ذیل اشعار اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ آپ نے ناقدوں کی پروان چڑھائی ہوئی تحریکوں سے اپنا دامن بچا کر وہی کہا ہے جو آپ کے دل اور دانشوری کا تقاضا سنا تھا :

پھر ہجومِ غم و جذبات کبھی ہو کہ نہ ہو
تم سے کہنے کو کوئی بات کبھی ہو کہ نہ ہو
آج تو ایک ہی کشتی میں ہیں منجدھار میں ہم
پھر یہ مجبوریٔ حالات کبھی ہو کہ نہ ہو
معلوم نہیں دوزخ و جنت کی حقیقت
چلتے ہیں ہر اک راہ پہ از راہِ عقیدت

بڑھ گیا زور دیوانگی میں
تم نے کیا کہہ دیا تھا ہنسی میں
جی رہے ہیں کسی کے لئے ہم
ورنہ کیا لطف ہے زندگی میں

یہ ستونِ سرپرستی نہیں راسِ حسن فن کو
جو عزیز باغباں تھے، وہی پھول کم کھلے ہیں

بڑا ہی ناز تھا اپنی خنک مزاجی پر
زمیں کے تپتے توے پر جھلس گیا پانی

اجنبی کیوں ہوگیا ہے اپنا گھر
بے وفا سے لگ رہے ہیں بام و در

میرے ماتم میں کبھی آنا پڑے
آتے جاتے دیکھ لیتے میرا گھر

ہر رات میں رونے والے کو آرام کی خواہش کیا جوہر
سبزے کا بچھونا کافی ہے ہاتھوں کا سرہانا کرلوں گا

اچھے شعر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہر ایک لئے کچھ نہ کچھ معنی رکھتا ہے۔ ذیل کے شعر میں آپ نے نہ جانے کتنے ناکام عاشقوں کے دل کی بات کہی ہے مگر یہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔ اگر ایک بیوی کو یہ پتہ چلے کہ اس کا شوہر اکثر یہ شعر دہراتا ہے:.....

مصلحت اور کہیں لائی ہے
دل کسی اور کا شیدائی ہے

تو گھر میں مہابھارت بھی ہوسکتی ہے۔ آگے بڑھتے ہیں:

نعمتیں ساری ہیں دنیا میں میسّر لیکن
سر پہ لٹکی ہوئی تلوار نظر آتی ہے

ایک ہنگامۂ دیدار کے بعد
پھر وہی غم، وہی تنہائی ہے
ترنم خیز جمنا کے کنارے
کسی کی یاد پیہم آرہی ہے
ہم اپنے دل کا دکھڑا رو رہے ہیں
تمہاری آنکھ جھپکی جارہی ہے

شاعر لفظوں سے کس طرح تصویر بناتا ہے اس کی بہترین مثال ہمیں ذیل کے شعر میں ملتی ہے.....

تم اپنے دھیان میں ڈوبی ہوئی ہو
تمہاری اوڑھنی لہرا رہی ہے

اگر یہاں ''دھیان'' کی جگہ ''خیال'' ہوتا تو اور بھی لطف دیتا۔ اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسے اردو اور ہندی دونوں ''لپی'' میں شائع کیا گیا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کے لئے بھی تسکین کا ذریعہ ہے جو اردو لپی سے عدمِ واقفیت کی وجہ سے خالص ادب سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس کتاب کو ہندی میں شائع ہی نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہندی کے الفاظ کو بخوبی استعمال بھی کیا گیا ہے۔ ایک خوبصورت نمونہ دیکھئے:.....

ملنے کی اُتم اِچھا تھی، راتوں رات لکھی اک پاتی
میں دکھیاری غم کی ماری، آنگن چوک بہاروں کیسے

جیسا کہ کہنہ مشق شعراء کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اس طرح آپ بھی اس خصوصیت کے حامل ہیں۔ آپ نے غزل اور نظم کے علاوہ قطعات اور دوہے میں بھی بخوبی اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

مذہب کی ترازو میں وطن بانٹ رہے ہیں
میدانِ سیاست میں لہو چاٹ رہے ہیں

یہ دیش کے نیتا تو ہیں خود اپنے ہی دشمن
جس شاخ پہ بیٹھے ہیں اسے کاٹ رہے ہیں

کسی نے ساحل سے یوں پکارا
ہو جیسے ہم دم کوئی ہمارا
لگا کہ ابھری بھنور سے کشتی
لگا کہ اب مل گیا کنارا
ظلمتِ شب میں اک سویرا سا
دھوپ میں دن کی گھپ اندھیرا سا
زلف و رخسار کا حسین سنگم
چاند پر بدلیوں کا گھیرا سا

دوھے

زخمی ہے انسانیت دکھیا ہے سنسار
پھر بھی اس ماحول سے کوئی نہیں بیزار

کس کی زلفوں نے مرا چھین لیا سکھ چین
روح پہ چھائے ہیں مری کس کے سندر نین

آپ کی شاعری لفظوں کا گورکھ دھندا نہیں ہے بلکہ بامقصد اور بامعنی ہے، اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ کتنا ہی بڑا شاعر ہو، ادیب ہو، نقاد ہو، سرسری پڑھ کر نظر انداز نہیں کر سکتا۔

OO

Faraz Arif
U-Take Coaching Class, C/o Madina Kirana Shop,
Muzaffarnagar, Post Akola, Distt. Akola (Maharashtra)

○ کلدیپ گوہر

جناب بی ایس جین جوہر نے قصبہ امین نگر سرائے، میرٹھ (اتر پردیش) میں مئی ۱۹۲۷ء میں ایک متمول گھرانے میں آنکھ کھولی۔ مصنف نے ' کچھ اپنے بارے میں' کے عنوان سے لکھے مضمون میں واضح کیا ہے کہ شوق نے صغرسنی میں ہی اسے جکڑ لیا اور وہ ابھی جماعت ہشتم کے طالب علم تھے کہ ان کا کلام مشہور اخبار 'تیج' دیلکی میں شائع ہونے لگا۔ شاعری میں جوہر علامہ سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ہیں۔ عمر کی ۷۸ بہاریں دیکھنے کے بعد اور چھ دہائی سے زیادہ شعری سفر طے کرنے کے بعد موصوف مجموعہ زیورِ طبع سے آراستہ کیا ہے۔

زیرتبصرہ شعری مجموعے میں اُنیس نظمیں، اکتیس غزلیات، چھتیس قطعات اور آٹھ دوہے ہیں اور ان کے مجموعی تاثر کا نام 'ترانۂ بیداری' ہے جس سے موصوف کی شعری توانگری اور مختلف اصنافِ سخن پر اس کے عبور کا ثبوت مہیا ہو جاتا ہے۔ مجموعے کی ابتدا میں معروف شاعر اور نقاد جناب رفعت سروش کا تجزیاتی تبصرہ شامل ہے جو پندرہ صفحات پر محیط ہے۔ اس سے شاعر کی علمی و شخصی حیثیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ موصوف در و بست پر مضبوط گرفت اور وسیع معنیاتی تسور کا حسین امیج بھی ہے۔ 'ترانۂ بیداری' درسِ آدمیت، اوشا، فطرت کا پجاری، بن کے پریت، نجمہ، پہلے آؤ تو سہی یہ سب ایسی نظمیں ہیں جن میں رنگِ تغزل اپنی تمام خصوصیات اور کیفیات یعنی جذبات کی گرمی و لطافت، تخیل کی بلندی، زبان کی گھلاوٹ اور غنائیت سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جاگ اٹھو اے سونے والو
سب کچھ پاکر کھونے والو
خلوت کی تاریک فضا میں
اشکوں سے منہ دھونے والو
تم نے اپنی قدر نہ جانی

پھولوں سے شادبی لے کر
جگنو سے بے تابی لے کر
زہرہ کی ننھی شرمیلی
آنکھوں سے بے خوابی لے کر
راہ میں اپنی بڑھتے جاؤ

[ترانۂ بیداری]

دور کہیں وہ گونج رہی ہے رادھا کی آواز
ایک معمہ ہے وہ شاعر اور سراپا راز
شبنم کی موسیقی ہے اور بادِ سحر کے ناز
اس نغمے پر جھوم کے بدلی اٹھا رہی ہے ساز
اے شاعر، اے حسن کے شیدا، اے فطرت کے پجاری

[فطرت کے پجاری]

غزلیات کا معاملہ جہاں ہم پر بہت کچھ منکشف کرتا ہے وہیں فکر وخیال کے بے شمار باب بھی وا کرتا ہے جن سے جوہر کے تجرباتی ذہن کی پوری عکاسی ہوتی ہے۔ غزلوں کے تلازمات ان کے اپنے عہد کے حیات و کائنات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اشعار میں جذبے کی صداقت اور خلوص کے ساتھ فکر کی شائستگی ہے۔ مجموعے سے چند منتخب اشعار پیش ہیں:

کس کو رہنما کہیے کس کو ناخدا کہیے
ڈوب جائے جب کشتی پھر کسی کو کیا کہیے
عہدِ وفا کسی سے محبت کسی کے ساتھ
کیوں کھیلتے ہیں آپ میری زندگی کے ساتھ
جو جلاتا ہے میرے غم کے اندھیرے میں چراغ

میرے ہاتھوں میں وہی بات کبھی ہو کہ نہ ہو
ابر میں جیسے آفتاب کھلے
رک پہ یوں زلف کی نقاب کھلے
میرے ماتم مین کبھی آنا پڑے
آتے جاتے دیکھ لیتے میرا گھر

اب ایک قطعہ اور ایک دوہا سے بھی لطف اندوز ہولیں:

نہ کسی کے من میں گلا رہے
نہ ہی کوئی مجھ سے خفا رہے
میں کسی کے کام تو آسکوں
یہی میرے لب پہ دعا رہے

روپ، جوانی، کامنا ہیں دولت کے کھیل
سوکھے ہوئے درخت پر چڑھتی نہیں یہ بیل

غزلوں کے اشعار میں روانی اور رنگِ تغزل ہے مگر کہیں کہیں تقابلِ ردیفین پایا جاتا ہے۔ اگر چہ موصوف کہنہ مشق ہیں تاہم اپنی کاروباری زندگی مین بے حد مصروف رہنے کے باعث ایک وسیع حلقے میں وہ معروف نہیں ہو سکے۔ امید ہے کہ شعری مجموعہ اردو اور دیوناگری رسم الخطوں میں ایک ساتھ شائع ہونے کے سبب زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے گا جس کے باعث ان کی شخصیت اور کلام سے زمانہ متعارف ہو جائے گا۔

کتاب کا سرورق دلکش اور جاذب نظر ہے۔ کتاب کی پشت پر مصنف کی شبیہ سے مزین ہے۔ ناشر کی پیش کش مین خوبصورتی، ہنرمندی اور سلیقہ ہے۔ کتاب کی پذیرائی ادب شناسی کی معتبر پہچان سمجھی جائے گی۔

(مطبوعہ دیکھی 'ہماری زبان'، شمارہ ۱۵ تا ۲۱ / مارچ ۲۰۰۷ء)

OO

زیرِ نظر ''ترانۂ بیداری'' بی ایس جین جوہرؔ کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جن میں چند قطعات اور دوہے شامل ہیں جوہرؔ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن ان کی غزلیں بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔

بی ایس جین جوہرؔ نے ایک ایسے دور میں شاعری شروع کی جب عالمی منظرنامہ پر دوسری جنگِ عظیم جاری تھی اور انگریزی سامراجیت کے خلاف ہندوستان کی جنگِ آزادی اپنے شباب پر تھی۔ جوہرؔ نے اپنے ہم عصروں کی طرح اپنی بیشتر نظموں مین قوم کو بیدار کرنے کی غرض سے کئی خوبصورت نظمیں تخلیق کی ہیں جن میں ''ترانۂ بیداری''، [الوداع اے وطن''، ''پیامِ شوق''، ''وفا کی دیوی''، ''درسِ آدمیت'' اور ''محبت کس طرح کرلوں'' قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظموں میں قوم پرستی اور وطن پرستی کا غلبہ زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر نظم ''ترانۂ بیداری'' کے دو بند ملاحظہ فرمائیں.....

آؤ اے ارجن کی اولادو!
قصرِ وطن کی اے بنیادو
طوفانوں سے لڑنا سیکھو
دولت کی تعمیر گرادو
تم پر ہیں دنیا کی نگاہیں
قدرت پر انصاف نہ چھوڑو

ظلم و ستم کی گردن توڑ دو
روگ بڑھاپے کو للکارو
موت کی ظالم باہیں مروڑو
دنیا گن گائے گی تمہارا

اردو کے تقریباً تمام شاعروں نے اپنی شاعری میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو جگہ دی ہے۔ اگر ایک طرف روزگار کا غم ہے تو دوسری طرف محبوب کے لب و رخسار، زلفِ سیاہ، گیسوئے دراز، ساعد سیمیں، سرو قامت اور اندیشہ ہائے دور دراز کا ذکر ملتا ہے۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی سب سے زیادہ فیض احمد فیضؔ کی شعری کائنات میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ جوہرؔ صاحب نے بھی ان دونوں موضوعات پر فراخ دلی سے خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کی نظم ''محبت کس طرح کرلوں'' میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کے خوبصورت امتزاج کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد فیض احمد فیضؔ کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ ''اوشا''، ''نجمہ سے''، ''تم جاگو گی صبح سویرے''، ''آؤ تو سہی'' اور ''بن کی پریت'' بہت ہی خوبصورت نظمیں ہیں۔

پیشِ نظر مجموعہ میں ڈھائی درجن کے قریب غزلیں بھی شامل ہیں۔ جوہرؔ کی غزلوں کی خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں سادگی، صفائی، البیلا پن اور شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ ان کی غزلوں میں فکر کی تلاش کرنا لاحاصل ہوگا کیوں کہ وہ تو کیفیت کے شاعر ہیں۔ انہوں نے زندگی کو جس طرح دیکھا، پرکھا اور محسوس کیا، اسے اسی طرح صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جوہرؔ کی غزلیہ شاعری میں استعارہ سازی، علامت نگاری اور پیکر تراشی کی کرشمہ سازی بہت کم نظر آتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں تو صرف جوان دلوں کی دھڑکن سنائی دیتی ہیں۔ چند اشعار دیکھئے:

کبھی مائلِ تکلم، کبھی دل میں ہے تلاطم
کبھی بولنے کی کوشش، کبھی بول بھی نہ پانا

رگوں میں خون گردش کر رہا ہے
جوانی سازِ دل پر گا رہی ہے
فطرت اداس سی ہے، گھٹائیں ہیں سوگوار
اک غم نصیبِ حسن ہے ابرِ بہار میں
عہدِ ماضی کے فسانے ہی سنالیں تم کو
اتنی خاموش کوئی رات، کبھی ہو کہ نہ ہو

زیرِ نظر مجموعہ میں صرف پابند نظمیں ہی شامل ہیں اور سب کی سب آزادی کے قبل کی ہیں۔

کتاب بہت ہی خوبصورت شائع ہوئی ہے۔ ٹائٹل پیج دیدہ زیب ہے۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اردو دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں ایک ساتھ شائع ہوئی ہے۔ امید ہے کہ ''ترانۂ بیداری'' سے اردو خواں طبقہ کے ساتھ ساتھ غیر اردو داں طبقہ بھی مستفید ہو سکیں گے۔

مطبوعہ :عالمی سہارا، نئی دہلی

OO

جوہر صاحب کو میرا مضمون از حد پسندِ خاطر ہوا اور وہ میری جانب نہ صرف راغب ہوئے بلکہ اپنے فن اور شخصیت پر اس کتاب کو مرتب کرانے کے لیے بخوشی راضی ہو گئے، یہی اس کتاب کی وجہ تسمیہ ہے اور اس کا ثمرِ پیش رس، یہ تازہ کارِ تخلیق ہے۔ میں نے جب، اس موضوع پر کام شروع کیا، تو اپنے احباب اور مقتدر قلمکاروں کو جوہر صاحب کے فکر و فن پر مزید مضامین لکھنے کی فرمائش کی، خدا کا شکر ہے کہ میری گذارش پر نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستانی احباب نے بھی لبیک کہا اور یکے بعد دیگرے مضامین، مراسلات، تأثرات آنے لگے، مثلاً ندا فاضلی، افتخار امام صدیقی، یوسف ناظم، عبدالقوی دسنوی، بشیر بدر، خلیق انجم، رضیہ حامد مناظر عاشق ہرگانوی، محمد ایوب واقف، سیفی سرونجی، اختر شاہجہانپوری، سید احمد سحر شاہجہانپوری، فصیح اکمل شاہجہانپوری، مولانا قمر شاہجہانپوری وغیرہ کے علاوہ بھی ہند و پاک کے متعدد اصحاب نے اپنے مضامین سے نوازا۔ ان سب کا میں بصمیمِ قلب ممنون ہوں۔

بہر نوع! جوہر صاحب کے مزاج و مذاق میں استواری اور استقامت ہے، اپنے اصولوں پر یہ ہمیشہ سے کاربند ہیں، ان کے یہاں نہ ضد ہے، نہ ہی زیادتی اور نہ ہی سرکشی! اس کے برخلاف، ان کے یہاں ظرف کی کشادگی، ضمیر کی صفائی اور قلب کی پختگی ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر حریفانِ بادۂ پیما کے مقابلے میں فتح و کامرانی، قدرت کی جانب سے، جوہر صاحب کے حصے میں وافر مقدار میں آئی ہے، جوہر صاحب اس نفیس و سلیس اور نستعلیق تہذیب و شرافت کا ایک نمونہ ہیں، جو اردو زبان و ادب سے منسوب کی جاتی ہے، اسی تہذیب و شرافت کی نزاکت و صلابت ان کی شخصیت میں یکجا ہو گئی ہیں، گویا، مشرق و مغرب کے تمام تہذیبی اثرات ان کے یہاں بیک وقت اپنی پوری تب و تاب سے جلوہ فگن ہیں! جوہر صاحب، خوش خلقی میں بھی متواضع اور متبسم ہیں، خلوت ہو یا جلوت، گھر ہو یا دفتر یا بزم سخن کی محفل، سدا چمکتے چہرے اور چہکتے اندازِ تخاطب سے اپنے مخاطب کو پوری طرح مسحور و متأثر کر لیتے ہیں۔ اپنے احباب، اپنے ساتھیوں کے ذیل میں بھی یہ خیالِ خاطر احباب کے ساتھ آبگینوں کی نزاکت کا پورا لحاظ رکھتے ہیں!

منتخب

مراسلے

مکرمی جوہر صاحب، آداب و نیاز

اس امید کے ساتھ کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

''ترانۂ بیداری'' موصول ہوا۔ شکریہ۔

ارے بھائی جو شاعر بڑے اعتماد کے ساتھ اس طرح کے شعر کہہ سکتا ہے، اس سے میرا اور اربابِ نظر کا یہی تقاضہ ہوگا کہ اگر آپ نے شعر گوئی کا سلسلہ قائم نہ رکھا تو یہ بڑا ظلم ہوگا۔

وفا کے ساز پہ گاتا ہوں نغمے زندگانی کے
مری آواز، آوازِ دو عالم ہوتی جاتی ہے
پاؤں رکھتا ہوں تو دھنستی ہے زمیں
سر اٹھاتا ہوں تو سر لگتا ہے

آپ کی شاعری حقیقی جذبوں اور وارداتوں کی شاعری ہے۔ مجھے خوشی ہوگی گر آپ اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

مخلص

عتیق اللہ

Mobile : 09810533212

○○

اچانک ایک شعری مجموعے نے، روزانہ موصول ہونے والی بہت ساری کتابوں اور رسائل کے ڈھیر میں گم ہونے کی بجائے دو، تین سطحوں نے اپنی طرف متوجہ کرلیا.....(۱) غیر مسلم اردو شاعر، (۲) نہایت ہی پختہ کلام، (۳) علاّمہ سیمابؔ اکبرآبادی کے تلامذہ میں سے ایک، (۴) اردو کے ساتھ ہندی رسم الخط میں طباعت، (۵) چھوٹا کنبہ مگر تجارت پیشہ، (۶) اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی مہارت حاصل ہے، ہندی بھی سمجھتے ہیں۔

یہ تمام امور کسی بھی مدیر کو اپنی طرف فوری متوجہ کرنے کے لئے بہت ہیں۔ اساتذہ کا احترام، ان کے دواین کا مطالعہ اور قابل استاد کے شاگرد ہونے کا ثمر، ان کی شاعری کے وہ روشن پہلو ہیں جن سے سرسری گذر جانا ممکن نہیں۔ میں نے اس مجموعے کو نمک کی طرح چکھا، بھری ہوئی دیگ سے چاول کا ایک دانہ (شعر) منتخب کرکے، پوری شاعری کو آنکا اور محسوس کیا کہ یہ پرانی وقتوں کی نہیں بلکہ معاصر اردو شاعری کے مختلف النوع رنگ ہیں اور دلپزیر خوشنما بھی۔ اب استادانہ شاعری خال خال رہ گئی ہے۔ یہ مجموعہ ایک مثال ہے۔

''ترانۂ بیداری'' کی شاعری بی ایس جین کا فخر ہے جس پر انہیں ناز ہے۔ توقع ہے کہ شعری زرخیزی کا یہ سفر جاری رہے گا۔

○○

Iftikhar Imam Siddiqui
Editor : "Shair" Urdu Monthly
202-228, Dinath Building, 3rd Floor, Room No.12, P. B. Marg,
Mumbai-400004, Mobile : 09324515157

○ مظہر امام

برادرِ محترم! سلام و نیاز

کئی ماہ ہوئے محبِ گرامی رفعت سروش نے آپ کا نہایت وقیع اور خوبصورت مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' مجھے پیش فرمایا تھا اور میں نے اپنے تاثرات سے آپ کو آگاہ کیا تھا۔ اب رفعت سروش صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ کو میرا کوئی خط نہیں ملا۔ میں نے کچھ اس طرح کی باتیں لکھی تھیں.....

''ترانۂ بیداری'' ایک پختہ کار شاعر کا کلام ہے۔ آپ کو زبان بیان پر غیر معمولی دسترس ہے۔ اپنے مزاج اور طرزِ اظہار کے اعتبار سے آپ جوشؔ، سیمابؔ، تلوک چند محرومؔ چکبستؔ اور احسان دانش کے قبیلے کے شاعر ہیں۔ اپنی کاروباری مصروفیات کے باعث آپ کو شعر گوئی کی طرف دلجمعی کے ساتھ توجہ دینے کا موقع نہ مل سکا ورنہ آپ یقیناً دورِ حاضر کے شاعروں کی صفِ اولیں میں شامل ہوتے۔ میں پروفیسر خالد حسین خاں کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے آپ سے ملاقات کا موقع فراہم کیا۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آپ کی صحت اور سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ۔

آپ کا

مظہر امام

○○

Mazhar Imam
176-B, Pocket-I, Mayur Vihar, Phase-1, Delhi-91
Phone : 011-22756049, 55818283

○ محمد ایوب واقف

محترم جناب بی ایس جین جوہر صاحب! آداب

امید ہے کہ آپ بہرصورت خیر و عافیت سے ہوں گے۔ آپ کا ارسال کردہ خوبصورت تحفہ آپ کے خط کے ساتھ ___ نواز ہوا۔ اس کرم فرمائی کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ البتہ آپ نے رفعت سروش کے جس خط کا ذکر کیا ہے وہ نہیں ملا، شاید رکھنا بھول گئے ہوں گے۔ آپ کی کتاب کے لئے میرا پہلا تاثر حاضر ہے.....

جناب بی ایس جین جوہر کا شاندار شعری مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' اسم با مسمّیٰ ہے۔ آج کل بازار میں شعری مجموعے کثیر تعداد میں آ رہے ہیں لیکن ایسے لاتعداد مجموعوں میں ایسے مجموعے کم ہی ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر دل و دماغ پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہوں بلکہ ایک طریقے سے یہ شعری مجموعے دل کو مکدّر کر دیتے ہیں۔ مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے کہ جناب جوہر صاحب کا شعری مجموعہ دل کو تسکین نہیں کرتا بلکہ اس کی ظاہری اور معنوی خوبیاں بلا کا ذہنی حظ عطا کرتی ہیں۔ ایسے مجموعے بلاشبہ اردو کے شعری و ادبی خزانے میں اضافے کا درجہ رکھتے ہیں۔ اردو کی شاعری اپنی جن صفات کے سبب باعثِ فخر و شرف رہی ہے وہ تمام صفات مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' کے صفحات پر نمایاں ملتی ہیں۔ میں ایسے گراں قدر شعری مجموعے کے لئے جناب جوہر صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں البتہ اس بات کا افسوس ہے کہ جوہر صاحب نے اپنا یہ جوہر تاخیر سے پیش کیا۔ خیر دیر ہی سے سہی ایک قادرالکلام شاعر کی شاعری سامنے آئی تو۔ مجھے امید ہے کہ ''ترانۂ بیداری'' پوری ادبی دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کرے گی۔

رفعت سروش صاحب سے ملاقات ہو تو ان کو میرا سلامِ شوق پہنچا دیں۔ وہ ہمارے لئے تبرک کا درجہ رکھتے ہیں۔ خدا انہیں زندہ و پابندہ رکھے۔

○○

Mohd. Ayyub Waquif
Mangal Ashish-B, Flat No.43, 4th Floor, Sector-12,
Koperkhairane, New Mumbai

○ عشرت قادری

مکرمی جوہرؔ صاحب! آداب عرض

آپ کا فرستادہ شعری مجموعہ ''ترانۂ بیداری''، ڈاکٹر رضیہ حامدؒ نے لا کر دیا جو انہیں کی معرفت آپ نے ارسال کیا تھا۔ آپ سے یہ پہلا غائبانہ تعارف ہے جسے میں اپنی محرومی سے تعبیر کرتا ہوں کہ آپ کا تعلق شاعر کی حیثیت سے آگرہ اسکول یعنی علامہ سیمابؔ اکبر آبادی سے ہے، اس کے باوجود میں نے اب سے پہلے آپ کی شاعری کیوں نہیں پڑھی؟ اس موضوع پر آئندہ کبھی موقع ہو تو گفتگو ہوگی۔

''ترانۂ بیداری'' ایک ایسے ادبی پبلشر (''نورنگ کتاب گھر'') نے شائع کی ہے جس کے روحِ رواں، اردو ادب کی وہ اہم اور معتبر شخصیت ہے جس نے مختلف اصناف میں گل کاری کی ہے کہ ان کے ادراک، بصیرت، ہوشمندی اور مسلسل جدوجہد و ہمہ گیری پر رشک آتا ہے، رفعت سروش کی کم و بیش نصف صدی کو محیط تخلیقی سرگرمیوں اور ادبی فتوحات اپنی ایک تاریخ رکھتی ہیں، وہ حقیقی معنوں میں لوح و قلم کے شیدائی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اردو زبان و ادب کو انہوں نے نت نئے موضوعات اور اصناف سے بھی روشناس کرایا ہے۔ وہ جس باریک بینی سے فن کو کسوٹی پر پرکھتے ہیں، ہمارے عہد میں اس کی مثال مشکل سے ہی ملتی ہے ظاہر ہے کہ شاعر کی نظر سے گزرنے کے بعد کوئی فن پارہ کتابی لباس میں اربابِ ذوق تک رسائی حاصل کرے گا اس میں کسی تنقید کی گنجائش کیوں کر ہو سکتی ہے؟ پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ آپ علامہ سیمابؔ اکبر آبادی سے شرفِ تلمذ رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے آپ کا رشتہ داغؔ سے ہوتا ہے۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

فقط مخلص

عشرت قادری

○○

Ishrat Qadri
Marakiz Adab, M.L.B.College Road, Bhopal

مکرمی و معظمی جناب بی ایس جین جوہرؔ صاحب!

آداب وخلوص

آپ کا عطیۂ گرامی بصورت ''ترانۂ بیداری'' دستیاب ہوا۔ کرم ارزانی اور شباب نوازی کے لئے شکریہ۔ کتاب کو جستہ جستہ پڑھا ہے۔ دیباچے تو مکمل پڑھ لئے ہیں۔ اپنے بارے میں بھی آپ کا نوٹ بہت دلچسپ ہے۔ آپ کی شاعری بھی اس زمانے کے موضوعات و مسائل کی بھرپور عکاسی کرتی ہے جس میں آپ کی شاعری کا آغاز ہوا اور ایامِ جوانی بسر ہوئے۔ جس خوش نصیب کو علاّمہ سیمابؔ اکبرآبادی جیسے استاد سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا اس کی شاعری میں پختگی اور تخلیقی استعداد یقیناً قابلِ رشک ہوگی ہی۔ واقعی اگر تجارت ناگزیر سلاسل رزق کی کڑیوں سے آپ نہ جکڑے جاتے تو اب تک آپ کی متعدد بیاضیں شائع ہو چکی ہوتیں۔ پھر بھی آپ نے راز و نیازِ عشق کی گتھیاں سلجھانے، ساتھ اپنے زمانے کے حالاتِ حاضرہ، تحریکِ آزادیٔ ہند اور متنوع مسائل پر قلم اٹھایا ہے اور ان پر ہی اپنی تخلیقی قوتیں صرف کی ہیں۔ زندہ باد!

یہ اچھا کیا کہ اردو اور دیوناگری دونوں لپیوں میں اپنا دیوان شائع کیا ہے تاکہ غیر اردو داں حضرات و خواتین بھی اس سے مستفیض اور لطف اندوز ہو سکیں۔ کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔

آپ مجھ سے عمر اور رتبے میں بہت Senior ہیں۔ آپ جیسے قدرداں دانش ور اگر مجھ ناچیز کی نظم ''سوتیلی ماں'' کی ستائش کریں تو اس سے بڑی کیا سعادت اور سند ہو سکتی ہے۔ یہ نظم ''جگ بیتی'' کے ساتھ آپ بیتی بھی ہے۔ ''انشاء'' کے مئی جون کے شمارہ میں اسی سلسلہ میں میرا خط شائع ہو چکا ہے۔ اس سے ماقبل شمارے میں آپ کا عنایت نامہ بھی میں نے پڑھ لیا ہے۔

یہ خاکسار بھی علامہ بشیشور پرشاد سکسینہ منوّر لکھنوی کے آستانِ فیض سے وابستہ رہا ہے جو ملک الشعرا منشی دوارکا پرساد افق لکھنوی کے فرزند ارجمند تھے۔ کچھ برسوں تک راقم نے ابوالفصاحت جناب جوشؔ ملسیانی سے بھی علمی و ادبی روشنی حاصل کی ہے۔ اب تک کمترین کی شعری و نثری تصانیف و تالیف کی تعداد لگ بھگ تیس تک پہنچی ہے۔ منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ (مرکزی سرکار) کی ملازمت میں بطور فیلڈ پبلسٹی آفیسر مختلف صوبوں میں دشت نوردی کی۔ ۱۹۹۱ء میں ریٹائر ہوا تو ۱۹۹۴ء میں ہماچل سرکار کے ادبی رسالہ سہ ماہی ''جدید فکر و فن'' کی ادارت بطور مہمان مدیر سنبھالی۔ دس برسوں تک باقاعدگی سے اس کے ۴۱ شمارے شائع ہوئے اب اس سے بھی سبکدوش ہو چکا ہوں۔ بیشتر وقت اپنے تخلیقی کام اور نیاز مندوں کی تخلیقات کی اصلاح کی خدمت میں صرف ہوتا ہے یا ''دادا گیری'' میں، (کیوں کہ جو بیٹا اور بہو ہمارے ساتھ رہتے ہیں، وہ صبح کام پر نکل جاتے ہیں اور ایک پوتے و پوتی کو ہمیں ہی سنبھالنا پڑتا ہے۔ دادا دادی کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے)۔

میری ہندی، پہاڑی اور اردو کی تصانیف میں سے ہندی تصانیف تو اب میرے پاس دستیاب نہیں، اردو مقالہ ''منوّر لکھنوی، ایک مطالعہ'' جو پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے، اس کی چند جلدیں میرے پاس بطور ریکارڈ محفوظ ہیں یا ۱۹۹۶ء میں مطبوعہ شعری مجموعہ ''اجنبی ہوا'' کی۔

گزشتہ ماہ میں اس خادم کا بارھواں شعری مجموعہ (اردو کلام) ''زندگی ایک سمجھوتہ'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے جو دلّی سے چھپا ہے اور بڑی نفاست کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ آپ اپنی تصنیف کے ساتھ اس کا تبادلی منظور کریں تو اپنی تین جلدیں مجھے بھجوا سکتے ہیں۔

محکمۂ تعلیم کی تھوک خرید کا اشتہار شاید آپ نے اخبارات میں دیکھا ہوگا۔ میں نے ۱۰ جولائی کی ٹربیون مین پڑھا تھا وہاں نمونہ کی جلد جمع کرانے کی تاریخ ۳۰ جولائی شام ۴ بجے تک ہے۔ وہاں نمونہ کی ایک جلد گورنمنٹ انٹر کالج نشاط گنج (لکھنؤ) میں مع کوائف جمع کرائی جا سکتی

ہے۔ میں بھی اپنے شعری مجموعہ کی نمونہ کی جلد وہاں بھجوا رہا ہوں۔ اس کالج میں محکمۂ تعلیم کا بک ڈسٹری بیوشن سنٹر اسی مقصد کے لئے قائم ہے۔ خرید کا فیصلہ تو کچھ عرصہ بعد سلیکشن کمیٹیوں کے ہاتھ ہوگا۔ راجہ رام موہن رائے لائبریری فاؤنڈیشن، کولکتا کی گرانٹ سے انگریزی، ہندی، اردو، سنسکرت وغیرہ کی کتابیں خریدی جاسکتی ہیں۔

یادآواری کے لئے مکرر شکریہ۔ امید ہے کہ معہ خاندان بصحت وعافیت اور سرگرمِ کار ہوں گے۔

نیازکش

ڈاکٹر شباب للت

○○

Dr. Shabab Lalit
B-179, Lnae-VII, Sec-3, New Shimla-171 009
Ph- 0177-26701079, 5533868

محسن بھوپالی (کراچی، پاکستان)

عزیزی گلزار جاوید کے توسط سے جناب جین جوہر صاحب کے کلام سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ میں یہ جان کر حیران ہوگیا ہوں کہ جین جوہر صاحب اتنے سینئر اور بلند قامت شاعر ہونے کے باوجود شہرت و ناموری سے دور کیوں ہیں۔ جین جوہر صاحب کی پختہ کلامی کا تقاضہ ہے کہ ان کی شاعری کا زیادہ سے زیادہ ابلاغ ہونا چاہئے اور مجھے بے حد خوشی ہے کہ میرٹھ کے ایک معروف قلم کار پروفیسر خالد حسین صاحب، جوہر صاحب کے فن پر ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں۔

محسن بھوپالی

(کراچی، پاکستان)

○○

مختصراً، کہا جا سکتا ہے کہ جوہر صاحب کی ایک سالہ رفاقت سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ علم مجلسی کے ماہر، نرم گفتار اور خوش خلقی کا مجسمہ ہیں، باتوں میں ظرافت کے پھول جھڑتے ہیں۔ شعری اور عروض مسائل و معاملات پر ان کی گرفت اور بات کی تہہ تک فی الفور پہنچ جانے کی خداداد صلاحیت کا معترف بھی ہونا پڑتا ہے، یہ ایک ایسی دُرّ نایاب اور جوہر کمیاب شخصیت ہیں کہ جن کی سخنوری اور ہنروری مسلّم ہے، مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ جوہر صاحب، دبستانِ سیماب سے وابستہ آخری معتبر مستند شخصیت کا نام ہے!!

بی ،ایس، جین جوہر صاحب کی شخصیت اور سیرت کے سلسلے میں اظہار خیال کے بعد، اس عندیہ کا اظہار بھی ضروری ہے کہ وہ شاعر کس پائے کے ہیں نیز دبستانِ میرٹھ کے شعراء میں ان کا مقام و مرتبہ کس نوعیت کا ہے، بہر نوع ان کی شاعری کے حسن و قبح پر بھی، راقم کے رشحاتِ قلم پیش ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں قطعاً عار نہیں کہ سرزمین میرٹھ، سدا سے ہی سیاست دانوں، سر فروشوں، صالحوں، صوفیوں، ادیبوں، شاعروں اور دیگر اصنافِ ادب سے وابستہ فنکاروں، جید قلمکاروں کی آماجگاہ رہی ہے مثلاً عرصۂ شعر و ادب میں، بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولوی عبدالرحیم، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر نور احمد میرٹھی، ڈاکٹر امیر اللہ شاہین، پنڈت ریوتی سرن شرما، انتظار حسین، اسمٰعیل میرٹھی، قلق میرٹھی، ندرت میرٹھی، تسکین میرٹھی حفیظ میرٹھی، بھارت بھوشن، دیپک قمر، بشیر بدر اور دوسرے بہت سے کاملینِ فن کا تعلق، اسی خلدِ بریں سے رہا ہے، اس تابندہ کہکشاں میں جوہر صاحب کو بھی بلا تأمل شامل کیا جا سکتا ہے! مقامِ حیرت ہے کہ جوہر صاحب کے پر کشش نقوش پر، زمانے کے سرد و گرم اور وقت کے جابر ہاتھوں نے کسی نوع کا اثر نہیں ڈالا! ان کی سدا بہار شخصیت کا راز میری نظر میں یہ ہے کہ ان کے دلِ مصفّٰی میں کثافت و کدورت، بغض و عناد، نفرت و حسد اور سیاست و منافقت کے جراثوموں نے ہنوز نفوذ نہیں کیا ہے اور یہ ان کی یلغار و یورش سے پوری طرح محفوظ و مامون رہے ہیں! یہی وجہ ہے کہ

قبلہ جوہر صاحب!

تسلیم

میں شکر گزار ہوں اپنے دیرینہ کرم فرما جناب رفعت سروش صاحب کا جنہوں نے آپ کی کتاب ''ترانۂ بیداری'' میرے پاس پہنچائی۔ مطالعہ کے دوران ایک بات جو کھل کر سامنے آئی وہ یہ کہ آپ کی شاعری میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک طبع زاد شاعر میں ہونی چاہئیں..... آپ فن شعر گوئی سے بخوبی واقف ہیں جس میں شائستگی، شعور، وقار، ضبط اور خودداری کے کئی رنگ نظر آتے ہیں۔ کاش آپ کاروباری زندگی کے ساتھ کچھ وقت سنجیدگی کے ساتھ اس طرف بھی نکال سکتے۔

آج کی شاعری جس کو جدیدیت، مابعد جدیدیت، ترقی پسندی اور زندگی سے قریب ہونے کے خانوں میں بانٹا جا رہا ہے وہ سب کلاسیکی شاعری کی ہی دین ہے۔ ان تمام خانوں کی شاخیں کلاسیکی شاعری سے ہی نکلی ہیں۔ آپ کی شاعری میں کلاسیکی رچاؤ ہے جس میں طبیعت کی افتاد اور روایت کا بڑا دخل ہے۔ غزل کے علاوہ آپ کی نظموں نے بھی متاثر کیا جن میں احساس کی شدت کے ساتھ معنویت بھی ہے۔

کتاب کی رسید کے ساتھ آپ کو مبارک باد بھی پیش کرتا ہوں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

مخلص

پی پی سریواستوا رند

○○

P. P. Srivastva 'Rind'
R-16, Sector-11, Noida-201301
Phone : 0120-2555937

○ عبدالرحمٰن مظہری

محترم بی ایس جین جوہر صاحب!

آداب

امید ہے بخیر ہوں گے۔ آپ کا محبت نامہ مجھے 19 رمئی کو ملا، وجہ یہ تھی اپنے گھر (بنارس) چلا گیا تھا اس لیے جواب لکھنے میں تاخیر ہوئی۔ آپ نے میری جو حوصلہ افزائی کی ہے اس کے لیے شکریہ۔

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر خالد حسین صاحب آپ کی شخصیت اور فن پر کتاب تحریر کر رہے ہیں۔ مزید خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ نے مجھ ناچیز کی ادنیٰ کوشش کو اس کتاب میں جگہ دلوانے کی کوشش کی اس کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ اور ڈاکٹر خالد حسین صاحب کا بھی کہ جنھوں نے اپنی کتاب میں مجھے جگہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے اپنا پتہ تبدیل کر دیا ہے۔ اس لیے اب اس پتے پر رابطہ قائم ہو سکتا ہے۔

ناچیز

عبدالرحمٰن مظہری

○○

Abdur Rehman Mazhari
C/o Mr. Iqbal Zia
Room No.-001, Lohit Hosatel, J N U, New Delhi-110067

برادرِ مکرم جناب خالد حسین خاں

سلام مسنون!

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں!

گرامی نامے کا جواب دے چکا ہوں اور فون پر بھی بات ہو چکی ہے۔ جناب والا کی فرمائش پر چند سطور لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ ترمیم و تنسیخ کا آپ کو اختیار ہے۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ جوہرؔ صاحب کی کتاب جلد چھپنے والی ہے۔ لہٰذا تاخیر نہ کروں۔

مجھے یہ دیکھ کر واقعی مسرت ہوئی کہ کتاب دونوں رسم الخط میں چھپی ہے۔ ان کی شاعری اپنے دور کی عکاس ہے۔ میری جانب سے ان کو مبارکباد دیجیے۔ آپ کے اسلوبِ دل نشیں کا میں نہ صرف معترف بلکہ مدّاح بھی ہوں۔ آپ کی مرتبہ کتاب کی پذیرائی اردو ادبی حلقوں میں ضرور ہوگی۔

امید ہے کہ مضمون کی رسید اور اپنی گراں قدر رائے سے نوازیں گے۔

متعلقین کو میری بہت بہت دعائیں۔

آپ کا بھائی

سید احمد سحرؔ

○○

Syed Ahmad Seher
43, Khaleel Gharbi, Near National Girls Inter College,
Shahjahanpur-242001 (U. P.)
Phone : 05842-223384

آج سے تقریباً چھبیس سو سال پہلے جین مذہب کے بانی مہاویر، زمین پر محبت اور انسانیت کا نور پھیلانے آئے، تیس سال کی عمر میں انھوں نے محل کی آسائشوں کو ترک کر کے، خود آگہی کا راستہ اختیار کیا۔ مہاتما بدھ اور مہاویر کا عہد تاریخی اعتبار سے ایک ہی ہے۔ بارہ سال کی گہری تپسیا کے بعد انھیں وہ روشنی حاصل ہوئی جو جین عقیدہ کی بنیاد بنی۔ مساوات، شانتی، محبت اور زندگی کے ہر روپ سے قربت اس روشنی کے مظاہر ہیں۔ یہی وہ خصوصیات ہیں، جن سے ہر عہد میں اُردو ادب بھی ہم رشتہ رہا ہے:

راہیں جدا جدا سہی منزل تو ایک ہے

بی ایس جین جوہر میرٹھ کے نواسی ہیں۔ اُردو سے ان کا لگاؤ، جین عقیدہ کی انسان دوستی کی پہچان ہے۔ انگریزی، ہندی کے ساتھ اُردو کو بھی انھوں نے اپنی تہذیبی وراثت میں شریک کیا ہے۔ پیشے سے تاجر ہیں اور مزاج سے شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' مشہور شاعر، ادیب رفعت سروش نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔

ندا فاضلی

○○

Nida Fazli
201, Sunrise, Aram Nagar, Versova,
Mumbai - 400061
Cell : 9821481079

مرتب کتاب کا مختصر تعارف

نام : (ڈاکٹر، حافظ) خالد حسین خاں، مہمندی

والدین : محترم قاری، حافظ، الحاج حمید اللہ خاں صاحب، مہمندی (مرحوم)

: محترمہ نفیس بانو صاحبہ

تاریخِ ولادت : 25/نومبر 1952

آبائی وطن : مہمند جلال نگر، ضلع شاہجہان پور (یوپی)

شریکِ حیات : راشدہ خاتون

اولاد : (۱) خان کامران خالد

: (۲) سمن خالد

شغل : تعلیم و تعلم

: صدر شعبہ اردو، میرٹھ کالج، میرٹھ (چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

(1975 تا حال)

پتہ : سمن زار، 27/10، شاستری نگر، میرٹھ 250003

موبائل :09358285859

ای میل :kamram@yahoo.com

B. S. JAIN JAUHAR

FUN AUR SHAKHSIYAT

By : DR. KHALID HUSAIN KHAN

ان کی بیشتر شاعری، قلبِ انسانی کی کثافت اور ذہنِ بشری کی خباثت کو دور کرنے کی بھرپور سعی کرتی ہے، کاش ان کی یہ شعری کاوش، قارئین کے دل و دماغ میں انسانیت، اشرافیت، اخلاقیت اور احساسیت کی خوبیاں بھی پیدا کر سکے!!

جوہر صاحب کے وسیع قلب اور شفاف نظر کی تابانیاں ان کے ''ترانۂ بیداری'' کے شیشے سے چھن چھن کر قارئین کے شعور کو بیدار کر کے ان کے دلوں کو مرتعش بھی کرتی ہیں! ''ترانۂ بیداری'' میں انیس نظمیں شامل ہیں اور ان نظموں کی اشاعت ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ کے دوران ہوئی یہ تمام نظمیں پابند ہیں اور سب میں زبان و بیان اور عروضی پابندیوں کا پورا التزام و احترام کیا گیا ہے۔ جوہر صاحب نے اردو زبان کو اردو زبان ہی کی طرح استعمال کیا ہے یعنی ان منظومات میں سنسکرت، ہندی، عربی فارسی اور انگریزی کے لفظوں کو بھی ایک فنکار جوہری کی طرح فٹ کیا ہے۔ شعری تخلیق کے دوسرے حصے میں پینتیس غزلیں، اڑتیس قطعات اور بارہ دوہے بھی قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے شامل کئے گئے ہیں۔ بالفاظِ دگر، ''ترانۂ بیداری'' تہذیبی، اخلاقی، انسانی اور درسی ارمغانِ شاعری ہے۔ جس طرح جوہر صاحب جوہر شناس، باشعور اور بے ریا شخص ہیں، ایسی ہی ان کی شاعری بھی ہے۔

جوہر صاحب کی منظوم تخلیق ''ترانۂ بیداری'' کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انہیں اپنے فنِ شاعری میں، ڈوب کر سراغِ زندگی پا جانے کی شدید خواہش ہے، جسے غالبؔ دوراں نے کہیں ہوس، کہا ہے تو کہیں آرزوئے ناتمام سے بھی تعبیر کیا ہے۔ بہرکیف! اس نوع کے خیالات، احساسات جنہیں ناقدینِ فن نے باطنی کرب اور فنی طرب سے موسوم کیا ہے، جوہر صاحب کے ذہن پر ہمہ پل سایہ فگن نظر آتے ہیں۔ عصری کوائف اور زمانی حقائق کی ''چبھتا'' اور ''چبھتا'' ان کے شعروں سے کہیں زیادہ ان کی نظموں سے مترشح ہے۔ دراصل، جوہر صاحب نے برسوں اپنے اس فنِ شاعری کو ''جانِ جاناں'' کی طرح پردۂ خفا میں رکھا اور بے حد غور و فکر یا پھر اپنے ذہن رسا کے اشاروں کے علاوہ رفعت سروشؔ کے مشوروں سے اپنے پہلے مجموعۂ

کلام کی اشاعت نے ہی ان کی شاعرانہ حقیقت، استادانہ اہلیت اور فنکارانہ بصیرت کا نہ صرف شیدائی بلکہ سودائی بھی بنا دیا! ناقدینِ فن اور محققینِ ادب نے ان کے کلام کو نہ صرف سراہا بلکہ ان کے معترف بھی ہوئے اور راقم مضمون بھی ان کا مدّاح ہوا!! جوہر صاحب کی شاعری، نظم وغزل، قطعات اور دوہوں کے بالاستیعاب مطالعے سے یہ بھی منکشف ہے کہ ان کی آواز توانا و تابندہ ہے، زندہ و زرفشاں ہے، ان کے سوچنے اور بیان کرنے کا انداز و اسلوب دلکشا، اچھوتا اور انوکھا ہے، زندگی اور سماج سے بھی ان کا رابطہ و رشتہ خاصا گہرا ہے، ان دنوں، جب ہم اپنے چہار سو، عہد جدید کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی منظر نامے پر نظر ڈالتے ہوئے، جوہر صاحب کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں وہ تمام مسائل و معاملات، سانحات اور حادثات، جو زندگی میں حقیقت کی اساس پر استوار ہیں، قرینِ قیاس نظر آتے ہیں مثلاً

طوفانِ شرر سے کھیلوں گا بجلی سے لڑوں گا گلشن میں
بنیاد تو رکھ ہی لی گھر کی تنکے بھی مہیا کر لوں گا
مندر و مسجد و گردوارے میں ماتھا ٹیکا
دل میں لیکن وہی شیطان بنائے رکھا

جوہر صاحب نے اپنی غزلوں، نظموں یا شاعری کو وسیلۂ افتخار اور سلسلۂ روزگار کا ذریعہ بھی نہیں بنایا بلکہ شانِ استغنائی اور بے نیازی ان کی فطرت ہے وہ شہرت سے بے نیاز اور گروہ بندیوں، جی حضوریوں، درباداریوں سے فرار کے باوصف، اپنی دنیائے شاعری کا جہاں، الگ بسائے ہوئے ہیں، شاید ایسے ہی قلندرانِ گوشہ نشینوں کے مقدر میں ربِّ قدیر کی جانب سے دلوں کی بادشاہی لکھی ہوتی ہے! چونکہ جوہر صاحب، اردو شاعری کے جھمیلوں سے دور، اردو مافیاؤں کے کھیلوں سے الگ اور اردو کے ناخداؤں سے جدا ایک ایسی سکون و سلامتی کی دنیا میں مگن رہتے ہیں جہاں ادب و شاعری زندگی کا مقصد نہیں، وسیلہ نہیں، یافت کا ذریعہ نہیں، بلکہ جہاں ذہنی مسرّت ہے، دنیاوی معاملات، سرکاری انعامات، جاہ و حشمت اور عہدوں و تمغوں کے

حصول کا ذریعہ نہیں! ان کی پوری شعری کائنات اور ان کی زیادہ تر نظمیں اور اکثر غزلیں، ان کی اپنی اسی دنیائے عافیت اور سکون و سرور کی آئینہ دار ہیں!!

جوہر صاحب کا ایک اور امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ پیشہ ور شاعر نہیں، تشاعر نہیں اور نہ ہی شعر کہنے کے لئے یہ اپنی طبیعت پر جبر اور اپنے دماغ پر بار ڈالتے ہیں بلکہ ان کے یہاں اشعار ازخود لاوے کی طرح بے محابا ابل پڑتے ہیں! اس فطرتِ عارفانہ اور جوشِ والہانہ کے ردِ عمل میں ان کے یہاں شعروں کا نزول اس خوبی کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس میں شبنمی ٹھنڈک اور نسیم سحر کی خنکی کے ساتھ ساتھ ترانۂ بیداری نیز جذبۂ خودداری کی حرارت و حلاوت، دبازت و لطافت محسوس کی جا سکتی ہیں!! اس کے باوصف ہمیں کہیں جلن تو کہیں کانٹوں کی چبھن کا بھی بخوبی ادراک و عرفان ہوتا ہے مثلاً اپنے عہد کی مرقع کشی اور روایتی کلاسیکیت سے مملو یہ اشعار۔

ترا حسن کا فرانہ، مرا عشق والہانہ — نہ تجھے خبر تھی اپنی، نہ مرا کوئی ٹھکانہ
مجھے دیکھ کر کسی کا سرِ راہ مسکرانا — یہی بات تھی ذرا سی یونہی بن گئی فسانہ

زبان کی چاشنی و چٹخارے کی خوبیاں دیکھئے۔

میری ہر بات پہ بے بات خفا ہوتے ہو — جانے کیا بات ہے دن رات خفا ہوتے ہو

محبوب کی قدیم روشِ عہد شکنی کا یہ انداز بھی ملاحظہ ہو۔

عہدِ وفا کسی سے، محبت کسی کے ساتھ — کیوں کھیلتے ہیں آپ مری زندگی کے ساتھ

عشق کا والہانہ انداز کس دل آسائی سے کیا ہے۔

وہ چلے بھی گئے چھوٹی سی ملاقات کے بعد — ہم نے دل میں انھیں مہمان بنائے رکھا

شوخیِ بیان، ندرتِ خیال اور معصومیٔ جذبات کا یہ انداز بھی دیدنی ہے۔

میرے ماتم میں کبھی آنا پڑے — آتے جاتے دیکھ لیتے میرا گھر

جدّتِ خیال، ندرتِ کلام اور تشبیہِ بے مثال دیکھئے۔

ابر میں جیسے آفتاب کھلے — رُخ پہ یوں زلف کی نقاب کھلے

ہندی اور اردو کا دلکش ''بھرت ملاپ'' بھی لائق تحسین و آفرین ہے، اس کو بھی ملاحظہ کیجئے:

سندر ،سکھد ، سُہانی شام
اک جانی پہچانی شام
لا ل کرن کا پہنے تاج
سورج کی پٹ رانی شام
نغمے گاتی ،جشن مناتی
دولت کی دیوانی شام

جوہر صاحب کا اختصاص یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کی مروّجہ تحریکوں سے متاثر ہوئے بغیر، وہی شاعری کی، جوان کے دماغ نے مناسب سمجھی اور دل نے ان کے دماغ پر جیسی دستک دی۔ اوران کا متحرک قلم ان کولفظوں کے گلدستوں میں سجاتا رہا۔

جوہر صاحب کے شعور و شعار نے اس وقت شاعری شروع کی جب ہندوستان فرنگی حکومت کا غلام تھا دیگر ہندوستانیوں کی طرح ان کے قلب و ذہن میں حصولِ آزادی کی تڑپ، طیش اور ترنگ پوری طرح موجزن نظر آتی ہے۔ ''ترانۂ بیداری'' نظم ان کے اسی داخلی کرب و کیفیت کی غماز ہے۔ اس نظم میں وہ اپنے ہم وطنوں کی غیرت، حمیت، غلامی اور بے حسی و بے کسی کی بیڑیوں کو کاٹ ڈالنے کی تلقین و تبلیغ کس دل سوزی اور دل آسائی سے عوامی زبان میں یوں کرتے ہیں ۔

جاگ اٹھو اے سونے والو! سب کچھ پا کر کھونے والو!
خلوت کی تاریک فضا میں ! اشکوں سے منہہ دھونے والو!
تم نے اپنی قدر نہ جانی
فطرت کا ہر منظر اٹّھا رہزن جاگا، رہبر اُٹھا
آزادی کا پرچم لے کر مزدوروں کا لشکر اُٹھا
سرخ پھریرے جھوم رہے ہیں

روح ہے تم میں طوفانوں کی　　پیاس، بجھاؤ ارمانوں کی
گونج رہی ہیں سرخ فضا میں　　چیخیں مظلوم انسانوں کی
دکھیاؤں کی بیواؤں کی
پھولوں سے شادابی لے کر　　جگنو سے بے تابی لے کر
زہرہ کی ننھی شرمیلی　　آنکھوں سے بے خوابی لے کر
راہ میں اپنی بڑھتے جاؤ

مذکورہ نظم، جوہر صاحب کی تخلیق کا سرنامہ بھی ہے، اس انقلابی اور جوشیلی نظم میں موصوف اپنے بھارت دیش کی پرانی پرمپرا پریم، پوتر دھرتی کی آن بان اور شان کا نہ صرف بکھان کرتے ہیں بلکہ اپنے دیش کے نوجوانوں کو دیش بھگتی کا سندر اُپدیش بھی دیتے ہیں اور دیش کی آزادی کے حصول میں اپنا سب کچھ تج دینے کی بھی تلقین وتبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔

جوہر صاحب نے حسن وعشق کے بیان میں بھی چٹخارے کی جگہ چاشنی سے کام لیا ہے، ان کے یہاں تصوراتی کیفیت کے برعکس تجرباتی کیفیت نمایاں ہے۔ افلاطونی عشق کے بجائے انسانی محبت کی کارفرمائی ہے۔

ان کی شاعری میں ہر رنگِ شاعری کی قوسِ قزح بکھری ہوئی ہے۔ چند مختلف رنگوں کی کہکشاں دیکھئے۔

مجھے دیکھ کر کسی کا سرِ راہ مسکرانا　　یہی بات تھی ذرا سی یونہی بن گئی فسانہ
تیرے حسن جاں فزا کی یہ ادائے کافرانہ　　وہ نگاہیں نیچی نیچی، وہ فراز زیر شانہ
کسی رسم بے لگن کے یہی رہ گئے ہیں شاہد　　یہ ستاروں کے چراغاں یہ فلک کا شامیانہ
پس وپیش کمسنی سے تُو کہیں بلند ہوکر　　مری شامِ زندگی میں تو چراغ بن کے آنا
ساون کی رت، بہار کا موسم، اندھیری رات　　رم جھم کے گیت گونج رہے ہیں پھوار میں
تسکین کے پھائے رکھوں گا، دکھیاروں پر، بیماروں پر　　تلخیٔ جہاں کا زخم تو میں دوروز میں اچھا کرلوں گا

B. S. JAIN JAUHAR

FUN AUR SHAKHSIYAT

By

Dr. Khalid Husain Khan

Head, Deptt. of Urdu
Meerut College, Meerut

Distributor

NIRALI DUNIYA PUBLICATIONS

358-A, Bazar Delhi Gate, Darya Ganj, New Delhi-110002
Phone: 011-23276094, Mobile: 0-9811270387

ہر رات میں رونے والے کو آرام کی خواہش کیا جوؔہر — سبزے کا بچھونا کافی ہے ہاتھوں کا سرہانا کرلوں گا

یہ ہندو لہو ہے کہ مسلم کا خوں ہے — کوئی جانچ کرنے کا اوزار ہوتا

[طنزِ ملیح]

نہ مسجد نہ مندر پہ تکرار ہوتی — کہ انساں کو انسان سے پیار ہوتا

[قومی یکجہتی کی خواہش]

جسے سب محبت سے مل کر مناتے — کوئی ایک ایسا بھی تہوار ہوتا

[تمنائے اخوت]

ہزاروں برس ہو گئے ساتھ رہتے — سول کوڈ مل جل کے تیار ہوتا

[زعفرانی فکر پر طنز]

بات غیروں سے تو ہنس ہنس کے کیا کرتے ہو — ہم سے ہوتے ہی ملاقات خفا ہوتے ہو

[شکوہ سنجی]

غم پرانا رفیق ہے اپنا — اس سے کچھ بے تکلفی سی ہے

[اظہارِ غم]

عیب اپنے نظر نہیں آتے — دل کے آئینے میں کمی سی ہے

[خودشناسی]

یہ غزل ہے کہ نظم بے عنوان — طرزِ تحریر کچھ نئی سی ہے

[افتخارِ فن]

جوؔہر صاحب کے اسلوبِ شعر میں اپنے عہد کے صفِ اول کے شعرا کی بازگشت کا بھی احساس ہوتا ہے مثلاً کہیں جگرؔ مرادآبادی، تو کہیں خمارؔ بارہ بنکوی، کہیں فیضؔ کا انداز ہے تو کہیں فراقؔ کا آہنگ، اس کے علاوہ جوؔہر صاحب کی نظموں مثلاً ''محبت کسی طرح کرلوں'' پڑھتے ہوئے ہمیں معاً فیضؔ کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' کی یاد آجاتی ہے۔ اسی طرح

جوہر صاحب کی نظم ''نجمہ سے.....'' کی قرأت کے دوران، ساحر لدھیانوی، اختر شیرانی بھی ذہن کے پردے پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ جوہر صاحب کی ''نجمہ سے'' ایک دلکش نظم ہے، اسی خیال کو نصف صدی قبل شاعرِ رومان، اختر شیرانی نے اپنی محبوبہ ''سلمیٰ'' کو مخاطب کرتے ہوئے کیف و رومان بھری نظم لکھی تھی۔ اس ذیل میں جاں نثار اختر کی ''انجم'' کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے!

بہر کیف! جوہر صاحب گرچہ، غیر معمولی (Extra Ordinary) ذہانت و فطانت کے حامل نہیں ہیں نیز ان میں کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام دینے کی صلاحیتیں بھی شاعرِ عوام نظیر، شاعرِ دوام میر، شاعرِ دوران غالب اور شاعرِ فلسفہ و فطرت اقبال جیسی نہیں ہیں تاہم ان کا یہ کارنامہ یقیناً غیر معمولی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے، اپنے عصر کے اور اپنے معاشرے و ماحول کے کچھ ذہنوں کو تلاش و تجسس، غور و فکر، سرور و سکوں، تطہیر قلب، امن و آشتی، اتحاد و یکجہتی اور درسِ انسانیت کی طرف ضرور مائل و متوجہ کیا ہے، دلدادۂ شاعری کے عمومی قارئین کے ذہنی دریچے وا کئے ہیں اور کچھ نئے مناظر، نئے مظاہر، نئے عناصر، نئے خیالات، نئے رجحانات، نئے جادے اور نئی روش سے اردو والوں کو ضرور روشناس و راغب بھی کیا ہے راقم کے خیال میں، جوہر صاحب کا نام، کام اور مقام میرٹھ کے دبستان شاعری میں ضرور باقی رہے گا!

یہاں اس امر کی جانب اشارہ کر دینا غالباً نامناسب نہیں کہ اردو زبان اور شعر و ادب کے بارے میں غیر اردو داں طبقے کو بالعموم یہ شکایت و شکوہ ہو رہا ہے کہ اس زبان نے اپنی دھرتی سے کم اور عرب و ایران سے زیادہ سروکار رکھا، نیز وہاں کی مروجہ تلمیحات، تشبیہات، استعارات، موضوعات اور انداز و اسلوب میں عربی فارسی کا رنگ و رجحان نمایاں ہے، لیکن مقام مسرت ہے کہ جوہر صاحب کی تخلیقِ شعری ''ترانۂ بیداری'' کی نظموں میں بطور خاص، ہندوستانی ماحول میں فرقہ پرستی کی جگہ فکر و فلسفہ اور گھر آنگن کی اور اپنے دیش و دھرتی کی سگندھ ہے۔ آج کے ہندوستانی ماحول، قومی یکجہتی، نفرت و نفاق کی جگہ اخوت و اتحاد اور کشت و خون کی جگہ آپسی پریم اور صلح و شانتی کی بے حد ضرورت ہے، ''ترانۂ بیداری'' اس ضرورت کو بخوبی پورا کرتی ہے۔ جوہر

صاحب نے ہندوستانی ثقافت، خلوص واخلاق اور باہمی پریم کو سادہ وسلیس دیسی انداز بیان میں بڑی سرلتا اور دلکش اسلوب شاعری میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری کا طرزِ نگارش بھارت کی گنگا جمنی تہذیب اور اخلاق واکیتا کی قدروں سے مملو ہے۔ ہندی کے سبک، سہج، سہل، سجل اور عام بول چال کے لفظوں کو اپنے شعروں میں برتنے میں بھی انہیں خاصا درک حاصل ہے!

میں گذشتہ چار دہوں سے اردو ادب کا قاری ہوں، مطالعہ کا رسیا ہوں، شاعری کا شیدا ہوں اس سلسلہ میں کوئی عمدہ مضمون، دلچسپ افسانہ، خوبصورت غزل، دلکش نظم، دلپذیر دوہے اور قطعے، اور دل آسا کتاب میسر آجائے تو دنوں، ہفتوں اور مہینوں اس سے لطف ولذت اٹھاتا ہوں، اپنی تنہائیوں میں اس سے مکالمہ کرتا ہوں، یہی نہیں، اپنے ہم خیال دوستوں، اپنے ہم مذاق ساتھیوں اور اپنے باشعور شاگردوں کو، اپنی اس خوشی، اس سرور اور اس ذہنی تلذذ میں شریک وسہیم کرنے کی سعی کرتا ہوں، اس ذیل میں کوئی نوواردِ قلم، باصلاحیت ادیب، ہوشمند قلم کار یا کسی اجنبی شاعر کا مجموعۂ کلام، مل جائے تو اس کی نثری کاوشات اور شعری طراوشات کو بطورِ خاص پڑھتا ہوں، چونکہ ہمارے ادبی جنگل میں بیشتر حضرات، پھل جھڑیاں چھوڑ کر غائب ہو جاتے ہیں اور اب تو نوبت یہاں تک آچکی ہے کہ برسوں میں کوئی نئی آواز، ایسی سنائی نہیں دیتی، کوئی نئی تحریر ایسی سامنے نہیں آتی اور کوئی نئی تخلیق اس نوع کی منصہہ شہود پر نمودار نہیں ہوتی کہ ذہن واحساس اور قلب ونظر کو پوری طرح اپنی گرفت میں جکڑ لے، بے محابا متاثر کرے، بے طرح فکر پر مائل کرے اور بے ساختہ سرور وانبساط سے بہرہ مند بھی کرے! ایسے ماحول میں اور اس ناگفتہ صورتِ حال میں جناب بی ایس جین جوہرؔ کی شخصیت، ان کی فنکاری، ان کی ہنروری اور ان کی سخنوری سے معمور ان کی زندہ وتابندہ، تازہ وتوانا شعری تخلیق، ''ترانۂ بیداری'' ہمارے ذہنوں کو آب حیات کی مانند جوش وجذبہ، جی داری وجنون اور زندگی وزمانے سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی بخشتی ہے اور عمر میں اضافہ بھی کرتی ہے!

جوہرؔ صاحب کی اس شعری مقبولیت میں ان کی معقولیت بھی شامل ہے، ان کی غزلیں

پرفشاں بھی ہیں اور پُرنور بھی! گویا ان کے یہاں میزانِ غزل میں احتیاط بھی ہے اور اعتبار بھی، اختیار بھی ہے اور اعتراف بھی، انسانیت بھی ہے اور اشرافیت بھی، یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح پھول میں خوشبو، چراغ میں روشنی، سورج میں حرارت اور چاند میں دبازت کا امتزاج!!

جوہر صاحب شاعری کے خصائص کے ساتھ ساتھ اس کے نقائص سے بھی آگہی رکھتے ہیں، اس لئے ان کے اشعار صحیح النسب اور نجیبُ النسل کہے جاسکتے ہیں!!

جوہر صاحب کے کلام دل نشیں پر اس کتاب میں ہندو پاک کے قلمکاروں نے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے روشنی ڈالی ہے اس لئے میں اپنے اس تعارفی مضمون میں وہی شعر نقل کر رہا ہوں، جن پر مذکورہ اصحابِ نقد نے اظہار خیال نہیں کیا ہے گرچہ یہ اپنی معلومات، فکریت، حسیت اور اظہاریت میں لاجواب ہیں۔ اس قبیل کے درج ذیل چند اشعار سے آپ بھی محظوظ ہوں۔

روح میں ہے بیتابی پنہاں — آنکھوں میں خوں نابی پنہاں
ہوک سی اٹھتی ہے اک دل میں — درد سا ہے جان بسمل میں
چاند سا مکھڑا باسی باسی — آنکھوں میں غمناک اداسی
عریاں سینہ ، بکھرے گیسو — منہہ پر زردی، آنکھوں میں آنسو

یاد سے کہہ دو، یوں نہ ستائے
ساون آیا، تم نہیں آئے

[نظم، برہ کا گیت]

نہ زندگی کا بھروسہ ، نہ موت ہی کا پتہ — گلے ملو کہ گِلے دور کرنے آیا ہوں
نہ جانے زندگی میں پھر کبھی ملیں نہ ملیں — تمھاری آنکھ کے تِل میں ٹھہرنے آیا ہوں

[نظم سریندر پرکاش کے نام]

نگاہوں کے شمع دان لے کر بلانے کو نقدِ جاں لے کر — ستم ظریفوں کے قافلے میں وفا شعاروں کو ڈھونڈتا ہوں
ساون کی رت، بہار کا موسم، اندھیری رات — رِم جھم کے گیت گونج رہے ہیں پھوار میں

ہیں زندگی کی راہ میں کانٹے بھی پھول بھی
چلنا تھا چند گام، کسی آدمی کے ساتھ

غم پرانا رفیق ہے اپنا
اس سے کچھ بے تکلفی سی ہے

روپ اور رنگ زیرِ آب کھلے
جیسے پیمانے میں شراب کھلے

میرے من کا کنول کھلے نہ کھلے
تیرے تن کا حسیں گلاب کھلے

دل کسی اور کی امانت ہے
اس لئے اس قدر حفاظت ہے

چاند مانگے سے مل نہ جائے گا
کیا بتائیں کہ کس کی چاہت ہے

زندگی یوں تو گذر جائے گی
کتنا مشکل یہ سفر لگتا ہے

اس خیال کو غالبؔ نے یوں کہا تھا۔

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا رہگذر یاد آیا

ریاکاری پر یہ شعر۔

مندر و مسجد و گرودوارے میں ماتھا ٹیکا
دل میں لیکن وہی شیطاں بنائے رکھا

مصلحت اور کہیں لائی ہے
دل کسی اور کا شیدائی ہے

وفا کے ساز پر گاتا ہوں نغمے زندگانی کے
مری آواز، آوازِ دو عالم ہوتی جاتی ہے

نگاہوں سے تمھاری ایک ترنّم سا برستا ہے
مگر باہر گرجتے ہیں ابھی طوفان رہنے دو

جس کی میّت میں تھے ہزاروں لوگ
زندگی اس کی بے مزا نکلی

یہ کمال دل کشی ہے کہ کرشمۂ پرستش
میں جہاں جہاں گیا ہوں وہ وہیں وہیں ملے ہیں

اِک ملاقاتِ سرِ راہ مختصر
کر گئی رنگین، دنیا کا سفر

زندگی کے بس یہی باقی نشاں
اِک چتا کی راکھ اور اِک چشمِ تر

کس سے پوچھا جائے جنت کا پتہ
اہلِ مذہب کو نہیں کچھ بھی خبر

مذہب کی روایات سے قائم رہا انساں
قانون نہ کر پائے گا دنیا کی حفاظت

جو جلاتا ہے میرے غم کے اندھیروں میں چراغ
میرے ہاتھوں میں وہی ہاتھ کبھی ہو کہ نہ ہو

جوہر صاحب کے چند آبِ زر سے لکھنے کے لائق قطعات سے بھی آپ محظوظِ خاطر ہوں :

رہزنوں کا ہے راج سڑکوں پر
لٹتی ہے گھر کی لاج سڑکوں پر
نسلِ انسانی ہے حادثوں کی شکار
خون بہتا ہے آج سڑکوں پر
[دہشت گردی]

دولتِ ننگ ونام پالی ہے
تہمتِ کسبِ زر اٹھالی ہے
ہائے توبہ میں زندگی گزری
ہاتھ خالی تھا، ہاتھ خالی ہے
[خالی ہاتھ]

نقش کچھ اتنے سلونے ہیں پری زاروں میں
گھر بنا لیتے ہیں جو ذہن کی دیواروں میں
حسن نسلوں کی امانت ہے حفاظت کے لئے
یوں تو لٹتا بھی ہے، بکتا بھی ہے بازاروں میں
[پری زار]

رنگین طبیعت کو روانی دے دے
راتیں ابھی کچھ اور سہانی دے دے
اے وقت کے قزاق مرا سب کچھ لے کر
لوٹی ہے جو تو نے وہ جوانی دے دے
[جوانی]

جیسے سلگی ہوئی الاؤ میں آنچ
جیسے پگھلا ہوا دھنویں میں کانچ
گردِ رخسار کھیلتیں زلفیں
رات میں جیسے جگنوں کا ناچ

[زُلف ورُخسار]

ہندو وجین عقیدہ وآستھا پر مبنی، یہ نظریۂ ''پُنر جنم'' کو بھی درج ذیل قطعہ میں کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے:

زندگی کتنی بے وفا نکلی
موت کی بھی وہ آشنا نکلی
کر کے ہم کو سپردِ خاک وکفن
گھر کسی غیر کے وہ جانکلی

[دوبارہ جنم]

شری جوہرؔ کے چند دوہے بھی لائق ذکر وفکر ہیں، ان سے بھی لطف ولذت، سرور وانبساط اور کیف حاصل کیجئے:

سندر سندر انکھڑیاں کومل کومل ہات
بستے ہیں آواز میں کوئل کے نغمات
زخمی ہے انسانیت دکھیا ہے سنسار
پھر بھی اس ماحول سے کوئی نہیں بیزار
لافانی ہو جائیں گے میرے سندر گیت
دل پر ہے انسان کے شاعر کی ہی جیت

جوہرؔ صاحب، کی مذکورہ نظموں، غزلوں، قطعوں اور دوہوں سے مزّین، اس تخلیق

(ترانۂ بیداری) کی مقبولیت میں ان کی معقولیت بھی شامل ہے، ان کی غزلیں پرفشاں بھی ہیں اور پرنور بھی! ان کی نظمیں، پراثر بھی ہیں اور پرزور بھی!! ان کے قطعات اور دوہے، پرلطف بھی ہیں اور پرکشش بھی!!!

گویا، ان کی تمام اصنافِ شاعری میں احتیاط، اعتبار، اختیار اور اعتراف کے علاوہ انسانیت اور اخلاقیت سبھی خصائص پوری طرح موجود ہیں:

بایں ہمہ، ''ترانۂ بیداری'' کے سلسلے میں راقم مضمون کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ کوئی ایسا شعری مجموعہ نہیں ہے کہ جس سے اردو شاعری کی دنیا میں کوئی انقلابِ عظیم برپا ہو جائے گا یا اس مجموعہ سے شعری فکر وفن کے افق پر کوئی نیا آفتابِ تازہ طلوع ہوگا اور نہ ہی اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ تخلیق، رفعت سروش کی محنت ومہارت اور جوہر صاحب کے جسمانی، ذہنی اور مالی تعاون سے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر نہ آتی، تو اردو کے دبستانِ شاعری کا نقصانِ عظیم ہو جاتا۔

ان سب کے باوجود ''ترانۂ بیداری'' کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک بے ریا، کہنہ مشق، معمر اور شریف شاعر کا بڑا شریفانہ اولیں مجموعۂ شاعری ہے جو قدیم اور جدید طرز نگارش کا ایک دلپذیر و دل آسا مجموعہ ہے!

جوہر صاحب کی ایک اور خوبی، جس نے مجھے متاثر کیا، یہ ہے کہ وہ نہ کہیں ''طرزِ کہن'' پر اڑتے ہیں اور نہ ہی ''آئینِ'' نو سے بھڑکتے ہیں بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک نیا جادو جگاتے ہیں!

یہ امر بھی لائقِ تحسین اور قابلِ توصیف ہے کہ جوہر صاحب کی جیسے جیسے عمر بڑھ رہی ہے ان کی شاعری ویسے ویسے جوان ہو رہی ہے، عمر کے آخری پڑاؤ میں، جہاں عمومی لوگوں میں بہت سے امراض بسیرا کر لیتے ہیں۔ اس کے برخلاف، جین جوہر صاحب پوری طرح چاق و چوبند ہیں یعنی ان کو نہ ہی نسیان ہے اور نہ ہی خلجان، بلکہ ان کا شعری گیان، دھیان اور رجحان مزید تر و تازہ ہوتا جا رہا ہے!

غالبؔ دوراں کے برعکس، جوہرؔ صاحب کے نہ ابھی قویٰ مضمحل ہوئے ہیں اور نہ ہی ان کے عناصر میں بے اعتدالی، اور نہ ہی دماغ میں کجی اور نہ ہی دلی خوشی میں کمی اور نہ ہی آنکھوں میں نمی، وہ مسلسل و متواتر، گلشنِ اردو کی سیاحی میں مگن اور چمنِ شاعری میں، بلبل ہزار داستاں کی طرح نغمہ زن ہیں!!

یہی وجہ ہے کہ موصوف کو جب فطرتِ شاعرانہ، مجبور کرتی ہے تو یہ اپنی نوائے شاعرانہ، ''ترانۂ بیداری'' کے عنوان سے ہمارے روبرو پیش کرتے ہیں، اپنی اس تخلیق کے بعد، جوہرؔ صاحب ایک نئے جوش، جذبے، جنون اور جی داری کے ساتھ متواتر ہی نئی غزلیات، منظومات اور قطعات ہندو پاک کے صفِ اول کے جرائد و رسائل میں مرسل کر رہے ہیں اور تمام مدیرانِ کرام بھی، ان کی نگارشاتِ شعری کو نمایاں اور ناز کے ساتھ شائع بھی کر رہے ہیں!

جوہرؔ صاحب، دوسروں کے برخلاف، حسن و تاثیر کی نت نئی ادائیں بیان کرنے میں مصروفِ کار رہتے ہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ جوہرؔ صاحب نے اپنے نصف صدی کے شعری سفر میں کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور آج بھی ان کے تخیل و تصور کے سوتے خشک نہیں ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کا ذہن محوِ پرواز ہے، قدم مائل بہ رفتار اور قلم مسلسل رواں دواں ہے۔

بحیثیتِ مجموعی، جوہرؔ صاحب نئے شاعر نہیں، نووارد قلم نہیں اور نو سکھیئے بھی نہیں۔ ان کی تازہ شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ نرم و نازک اور الھڑ زبان میں بھی شاعری کی جا سکتی ہے، ان کے یہاں رنگ، رس، رومان، روایت روانی بھی ہے اور سادگی، سلاست، سنجیدگی اور صفائی بھی! ان میں ایسا انکسار ہے جو علم و عمل اور حلم و عقل سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کی ''ترانۂ بیداری'' اور اس کے بعد کی لاتعداد شاعری میں ماں کی آغوش سے زندگی کے نوع بہ نوع دبستانوں تک کا وسیع و عریض منظر نامہ اور زمانے کا تابندہ سفر نامہ بھی ہے اور آزادئ وطن کا ترانہ بھی اور محبوبہ کے دل شکن انداز کا فرمانہ بھی!

غرضیکہ جوہرؔ صاحب اپنے شاعرانہ جوہر اور ساحرانہ گوہر کو مسلسل بال و پر عطا کرنے

میں پوری ایمانداری، جانفشانی اور جی داری سے لگے ہوئے ہیں۔ دبستانِ سیماب سے وابستہ، زندہ شاگردوں میں شری بی۔ ایس۔ جین جوہر یقیناً اپنا اور اپنے استاد کا نام تاریخ ادب میں ضرور روشن کریں گے اور سخنوران میرٹھ میں بھی امتیاز خاص کے حامل ہوں گے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

OO

Prof. Khalid Husain khan
27/10 Shastri Nagar,
(behind Iqra Public School)
Meerut - 250003 (U.P) M.:9358285859

بی۔ایس۔جین جوہر
فن اور شخصیت

مرتب:
ڈاکٹر خالد حسین خاں
صدر شعبۂ اردو، میرٹھ کالج، میرٹھ

تقسیم کار
نرالی دُنیا پبلیکیشنز
A-358، بازار دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-110002
فون:011-23276094 موبائل:0-9811270387

گذارشِ احوالِ واقعی

جب میرا مجموعۂ کلام ''ترانۂ بیداری'' پریس میں تھا تو جلدی میں میں نے اپنی زندگی کے کچھ حالات قلم بند کر کے '' کچھ اپنے بارے میں''، کے عنوان سے پریس میں دیدئے تھے اور سمجھا تھا کہ میرا کام ختم ہو گیا لیکن جیسے ہی کتاب بازار میں آئی اور ناقدان فن کے ہاتھوں میں پہنچی تو خطوط کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ زیادہ تر مکتوبات میں تو کلام کی تعریفیں اور تبصرے تھے۔ کچھ لوگوں نے میری زندگی کے تفصیلی حالات معلوم کئے کیونکہ زیادہ تر لوگ میرے نام، سوانح اور کوائف سے ناواقف تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی شاعر زمانۂ ماضی سے اٹھ کر چلا آیا ہو جس کی ادبی حلقوں میں نہ کوئی جان نہ پہنچان۔ غنیمت یہ رہی کہ کلام میں کوئی فنی نقائص کسی کو محسوس نہیں ہوئے، ورنہ میرے جیسے شاعر کے لئے حلقۂ ادب میں ٹکنا مشکل ہو جاتا، جبکہ شاعروں، ادیبوں اور ناقدینِ فن نے کھلے دل سے میرے کلام کو سراہا۔ اور میری بہت حوصلہ آفزائی کی۔ کئی لوگوں نے تو یہاں تک کہا کہ اگر آپ ساری عمر لکھتے رہتے تو اب تک 'ترانۂ بیداری' جیسے آپ کے کتنے ہی مجموعے شائع ہو گئے ہوتے اور آج آپ کی حیثیت اردو شاعری میں مستند اور مسلّم ہوئی ہوتی۔

اِدھر میری ملاقات ڈاکٹر خالد حسین صاحب، صدر شعبۂ اردو میرٹھ کالج سے میری کتاب کے اجراء کے سلسلے میں، میرٹھ کالج میں ہوئی۔ چونکہ میں میرٹھ کالج کا سابق طالب علم تھا اس لئے کالج نے ۲۱ فروری ۲۰۰۶ء کو میری کتاب کا اجراء ضلع میرٹھ کے ڈی ایم جناب رام کشن صاحب سے کرایا اور اسی سلسلے میں ایک مشاعرہ بھی منعقد کرایا گیا۔ اس کارروائی میں ڈاکٹر خالد

حسین خاں صاحب پیش پیش تھے۔ جناب رفعت سروش صاحب بھی نوئیڈا سے تشریف لائے اور مشاعرے میں شرکت فرمائی۔

اس دوران ڈاکٹر خالد حسین خاں صاحب نے ''ترانۂ بیداری'' کا پوری طرح مطالعہ کیا۔ میں نے وہ سارے خطوط اور تبصرے جو ملک کے گوشے گوشے سے ملے تھے۔ ان کو دکھلائے، سب کچھ پڑھنے اور دیکھنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ترانۂ بیداری اور میرے 'فن اور شخصیت' پر ایک کتاب مرتب کریں گے تاکہ یہ سب مضامین اور خطوط ریکارڈ پر آجائیں۔ انہوں نے میرا تفصیلی انٹرویو لیا اور سارے حقائق میری یادوں کے جھروکوں سے ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے۔ اسی گفتگو کا ماحصل ذیل میں درج ہے۔

میں ایک چھوٹے سے قصبہ امین نگر سرائے (تحصیل باغپت، ضلع میرٹھ) کے ایک متمول گھرانے میں بتاریخ ۱۰ مئی، ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوا۔ میرے آباو اجداد اس علاقے کے نامی گرامی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں 'سیٹھ جی' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ اچھا خاصہ بڑا زمین داری اور لین دین کا کام تھا۔ میرے دادا جی (بابا جی) سیٹھ آسا رام جی اپنے والد کے اکیلے بیٹے تھے۔ جب ان کو ورثہ میں زمین داری، لین دین کا کام آیا تو بہت پریشان ہوئے۔ زمانہ بالکل بدل چکا تھا۔ یہ دونوں پیشے سماج میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ جب کوئی آسامی ڈوبتی تھی تو سختی سے کام لینا پڑتا تھا۔ روزانہ مقدمہ بازی کی وجہ سے کورٹ کچہری کے چکّر لگانے پڑتے تھے اور آسامیوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ میرے بابا جی بہت نیک طبیعت اور رحم دل انسان تھے۔ آسامیوں کی تکلیف اور غریبی دیکھ کر اپنا اصل اور سود معاف کر دیتے تھے۔ پھر بھی ان کی خوشنودی حاصل نہ ہوسکی۔ ایک دن انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کیا اور جتنا بھی ان کا قرضہ لوگوں پر تھا سب معاف کر دیا۔ زمین داری ویسے ہی ختم ہو رہی تھی۔ اس لئے انھوں نے ایک صرّافے کی دوکان وہیں قصبے میں کھول لی اور زندگی کی ایک بالکل نئی شروعات کی۔ ایمانداری اور شرافت ان کے دماغ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بہت جلد

ان کی دوکان چل نکلی اور اپنی اچھی شہرت چاروں طرف پیدا کی۔ان کا رجحان گاندھی جی اور کانگریس کی طرف بڑھنے لگا۔گاندھی جی کا ساہتیہ پڑھ کر ان کے اصولوں پر چلنے کی کوشش کی۔دودھ اور گھی چھوڑ دیا۔کیونکہ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ گائے کے دودھ پر بچھڑے کا حق ہے۔انسان ان کا حق مار کر دودھ پیتا ہے لیکن اس کا ان کی صحت پر بہت برا اثر پڑا۔جسم سے کمزور تو وہ پہلے ہی تھے اب اور ہونے لگے۔

جولائی ۱۹۳۰ میں قصبہ امین نگر سرائے کی خاموش زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب آیا ۔جس کا کوئی سان گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ہمارے یہاں ایک شیتل پرشاد جی جو ہمارے کنبے ہی میں تھے۔پکے کانگریسی تھے۔کھادی کا چھوٹا کاروبار کرتے تھے۔سرکار میں ان کی رپورٹ پہلے ہی خراب تھی۔ہمارا قصبہ تھانہ بالینی میں پڑتا تھا۔ایک روز تھانہ بالینی کے داروغہ ان کے کپڑے کی قرقی کر کے نیلام کرنے آئے۔نیلام تو کیا ہونا تھا۔انہوں نے دوکان کا پورا کپڑا گھوڑے تانگہ میں بھرا اور تھانے کی طرف چل دئے۔سرکاری مخالفت کا دور دورہ تھا۔قصبہ کے بہت سارے لڑکے تانگہ کے پیچھے نعرے لگاتے ہوئے چلے۔کچھ دور چل کر انہوں نے تانگے پر پتھر پھینکنے شروع کر دیے۔داروغہ کو جب کچھ خطرہ محسوس ہونے لگا تو اس نے گولی چلا دی جو ایک نوجوان کو جس کا نام سانولیا تھا لگ گئی۔اور وہ جاں بحق ہوگیا۔بس پھر کیا تھا بھگدڑ پڑ گئی اور داروغہ نے اپنا تانگہ تیزی سے بھگوا کر تھانہ پکڑا اور اِدھر امین سرائے میں کہرام مچ گیا۔

داروغہ اس واقعہ سے بہت گھبرایا اور اس نے تھانے میں بیٹھ کر رپورٹ بنائی۔اتفاق سے اس وقت کسی اور تھانے کا کوئی اور داروغہ بیٹھا ہوا تھا۔اس نے سارا واقعہ سن کر داروغہ کو بہت ڈانٹا اور کہا کہ بچّو بری طرح پھنس جائیگا۔تو نے ایک آدمی کو جان سے مارا ہے۔تجھے سزا ہو جائے گی۔پھر اس نے بہت بھڑکاؤ رپورٹ لکھائی کہ وہاں بلوہ ہوگیا۔لوگ جان سے مارنے کو تیار ہوگئے۔جب مجھے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوا تو میں نے Self Defence میں گولی چلا دی جو ایک آدمی کو اتفاقاً لگ گئی وغیرہ وغیرہ۔یہ رپورٹ جیسے ہی میرٹھ پہنچی تو انگریز ضلع کلکٹر ایک

پوری لاری پولیس والوں سے بھر کر امین نگر سرائے میں آدھمکے اور جو جہاں ملا اس کو پکڑا۔ کل باون آدمی گرفتار ہوے۔

میں اس وقت صرف ساڑھے تین سال کا تھا۔ جب پولیس ہمارے گھر پہونچی تو میں ان کو دیکھ کر بہت زور سے چلایا۔ چار پانچ سپاہی تھے مجھے تسلی دینے لگے۔

''تجھ کو ہم تھوڑے ہی کچھ کہہ رہے ہیں تو کیوں چلاتا ہے''، میری ماں (میری دادی جن کو میں ماں کہتا تھا برتن صاف کر رہی تھیں ان سے رعب سے کہا بڑھیا بتا کہاں ہیں سب گھر کے؟ ماں نے کہا میں تو ان کے یہاں برتن صاف کرنے آتی ہوں مجھے نہیں معلوم، ڈانٹ کر بولے بڑھیا جھوٹ بول رہی ہے۔ پولس والے تھے۔ انہوں نے جب کمرے کا دروازہ کھٹ کھٹایا ان کو پتہ لگ گیا کہ لوگ اندر ہیں۔ انہوں نے زبردستی دروازہ کھلوایا اور چار پانچ آدمیوں کی پٹائی کر کے گرفتار کر کے ساتھ لے گئے۔

ادھر میرے بابا جی اور والد صاحب دوکان کے باہر بیٹھے تھے۔ وہیں پولس نے آ کر انہیں گرفتار کر لیا۔ اس روز کل باون آدمی قصبہ سے گرفتار ہو کر جیل بھیجے گئے۔ ہمارے بابا جی چونکہ وہاں کے خاص آدمی تھے، قصبہ کے چیرمین تھے اور کانگریسی تھے اس لیے ان کو دو سال کی سزا ہوئی اور والد چھ مہینے بعد جیل سے چھوٹ کر آئے۔ وہ دو سال ہمارے خاندان پر بہت گراں گزرے۔ بہت تکلیفات کا سامنا کرنا پڑا۔

تعلیم ہمارے قصبہ میں ایک پرائمری اسکول تھا جو وہاں کے شوالے میں قائم تھا اور ڈسٹرکٹ بورڈ اس کو چلاتا تھا۔ دوسرا مڈل اسکول تھا جہاں ساتویں تک تعلیم کا انتظام تھا۔ اونچی تعلیم کے لئے بڑوت میں دو اسکول تھے۔ ہمارے بابا جی نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ سات سال کی عمر سے پہلے بچے کو اسکول نہیں بھیجنا ہے اس لئے مجھے ساتویں سال میں لگتے ہی اسکول بھیجا گیا۔ چونکہ اسکول میں لیٹ داخل کرایا گیا۔ اس لئے میں نے بہت جلدی کورس پر قابو پانا شروع کر دیا۔ پرائمری اسکول میں بچوں پر کافی سختی کی جاتی تھی۔ کوئی لڑکا اگر بلا وجہ اسکول سے غیر

حاضر ہو جاتا تو چار لڑکے جلاّد کی طرح اس کے گھر بھیجے جاتے اور وہ اس کو ننگی کر کے (یعنی پایدستِ دگرے دست بدستِ دگرے) گھر سے کھینچ کر سارے بازار میں ہوتے ہوئے لے جاتے۔ وہ خوب روتا چلاّتا اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتا لیکن کیا مجال کہ 'ان جلاّدوں' کی گرفت سے نکل بھاگے۔ سیدھے اسکول لے جا کر ماسٹر جی کے سامنے پٹک دیتے اور مزے کی بات یہ کہ جو لڑکا تمام رستے چلاّتا ہوا آتا ماسٹر جی کو دیکھتے ہی اس کی روح فنا ہو جاتی اور وہ بھیگی بلّی کی طرح چپ چاپ بیٹھ جاتا۔ اب اس کی سزا کا نمبر آتا، شوالیہ میں کفیر کے پیڑ تھے۔ ماسٹر جی کا حکم صادر ہوتا کہ لچھی توڑ کر لاؤ۔ ماسٹر جی کے حکم کی تعمیل میں دو لڑکے فوراً جا کر بہت عمدہ لچھی توڑ کر لاتے اور ماسٹر جی لچھی کو ہوا میں ہلا کر آواز کرتے ہوئے لڑکے پر وار کرتے جس کا مقصد ڈرانا زیادہ اور چوٹ پہنچانا کم ہوتا۔ لڑکے بھی ایک ہی استاد ہوتے تھے۔ جیسے ہی لچھی بدن پر پڑی اور اس نے چلاّ کر نعرہ بلند کیا 'ماسٹر جی مر گیا' ماسٹر جی مر گیا'۔ ان الفاظ کا صحیح مطلب ماسٹر جی بھی خوب سمجھتے تھے اور لڑکے بھی چپ چاپ کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے تھے لیکن کیا مجال کہ ماسٹر جی کو ذرا سا بھی یہ احساس ہو جائے کہ لڑکے شرارت سے ہنس رہے ہیں۔

اس زمانے کے پرائمری اسکولوں کی ایک اور خاص بات تھی کہ مدرّسوں کی تنخواہیں بہت قلیل ہوتی تھیں۔ سال میں ایک بار ساون کے مہینے میں وہ چوتھ لینے ہر لڑکے کے گھر جاتے تھے۔ ساتھ میں ان کی ایک ٹولی کلاس کے لڑکوں کی ہوتی تھی جو زرق برق لباس پہنے ہوتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رنگین ڈنڈے ہوتے اور وہ رواج کے مطابق ڈنڈے بجاتے اور چوپائیاں گاتے ہوئے چلتے تھے۔ ہر طالب علم کے گھر پر ان کا سواگت ہوتا تھا۔ بہت عزّت سے ماسٹر جی کو بٹھایا جاتا اور اپنی اپنی حیثیت کے مطابق لڑکوں کے والدین ان کو بھینٹ دیتے تھے۔ اس طرح سے وہ خوشی سے وداع ہوتے اور دوسرے سب لڑکوں کے گھر جاتے۔ یہ ایک طرح کی ''ٹیچرس پیرینٹس میٹنگ'' ہوا کرتی تھی۔

اب میں اپنی تربیت کی کہانی پر لوٹ کر آوں۔ مجھے شروع سے ہی اردو ادب کا شوق تھا

۔ہماری دوکان میں کچھ اردو کی اچھی کتابیں الماری میں رکھی ہوئی تھیں۔جن میں خاص طور سے مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی پہلی سے پانچویں کتاب اور سفینۂ اردو وغیرہ تھیں۔ان کو نکال کر بیٹھ جاتا اور کئی کئی گھنٹے پڑھتا رہتا۔اس طرح بہت چھوٹی سی عمر سے ہی شعر وشاعری کا شوق پنپتا رہا۔پرائمری اسکول سے درجہ چار پاس کر کے مڈل اسکول میں داخلہ لیا۔

اس زمانے میں ۲۶ جنوری کو ہر سال 'یومِ تعلیم' کے نام سے منایا جاتا تھا۔ہر اسکول میں جلسے جلوس نکلتے تھے۔ہمارے مڈل اسکول میں بھی جلسہ تھا۔میں نے ایک مثنوی 'یوم تعلیم' پر لکھی تھی جو کچھ اس طرح کی تھی ''اگر ہندوستان میں دورۂ تعلیم ہو جائے۔جہالت دور ہو جائے فلاکت دور ہو جائے''،وغیرہ۔لیکن مصیبت یہ تھی کہ یہ میرا پہلا پبلک میں بولنے کا موقعہ تھا۔اس لئے دو تین شعر پڑھنے کے بعد میرے سر میں چکر آنے لگا اور گرتے گرتے بچا۔لڑکوں نے میری ہنسی آڑائی۔بزرگوں نے حوصلہ افزائی بھی کی۔میری عمر اس وقت صرف بارہ سال تھی۔مجھے مدت تک احساس کمتری ستاتا رہا۔اور پبلک میں بولنے اور شعر پڑھنے سے کتراتا رہا۔پھر جب ساتویں کلاس میں انگلش پڑھنے لگا تو ایک جگہ میں نے Edmund Berk کے بارے میں یہ پڑھا کہ وہ جب سب سے پہلے پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے تو نوجوان تھے۔پبلک میں بولنے کا ان کا کوئی واسطہ نہ پڑا تھا۔کسی ایک موضوع پر اتفاق سے وہ بولنے کھڑے ہو گئے۔ان کے منہ سے صرف یہ الفاظ نکلے تھے۔I Conceive I Conceive اور وہ ہکلانے لگے۔ایک بڑی اسمارٹ لیڈی ممبر نے فوراً اٹھ کر کہا Gentleman, you have conceived thrice but have produced no child ,Had I conceived once, I would have produced one child. پھر کیا تھا تمام پارلیمنٹ میں قہقہے ہی قہقہے منٹوں تک چلتے رہے اور Edmund Berk کا وہ حال کہ شرم سے پانی پانی۔اگلے روز سے انہوں نے پارلیمنٹ میں آنا بند کر دیا۔صبح سویرے گھر سے نکل کر گھنے جنگلوں میں چلے جاتے اور کسی ایک موضوع پر درختوں سے مخاطب ہو کر گھنٹوں گھنٹوں لکچر دیتے۔پھر پارلیمنٹ

کے current topics پر پوری پوری بحث کرتے۔ یہ سلسلہ مہینوں تک چلتا رہا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ لگی۔ جب خود پر پورا پورا بھروسہ ہوگیا تو پالیمنٹ میں لوٹ آئے اور اپنی قابلیت اور بولنے کی صلاحیت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اس وقت پارلیمنٹ میں Warren Hastings کے Impeachment پر زور دار بحث چل رہی تھی۔ انہوں نے اس Debate میں اپنی پروقار تقریروں سے تمام ایوان کو ہلا کر رکھ دیا۔ وارن ہیسٹنگز جو ہندوستان میں گورنر جنرل رہے تھے۔ ان کے بیگماتِ اودھ کو ستانے اور دیگر کالے کارناموں کی گونج برطانیہ میں پھیل چکی تھی اور پارلیمنٹ میں ان کے خلاف Impeachment کا پرستاؤ پاس ہوا۔ ان کی یہ تقریریں بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔ جو انگلش لٹریچر کے ایم اے کے کورس میں پڑھائی جاتی تھی۔ اس کو پڑھ کر دل میں دوبارہ نیا حوصلہ پیدا ہوا۔ Edmund Berk دل و دماغ پر چھا گئے۔ مڈل اسکول سے پانچویں کلاس پاس کر کے گرمی کی چھٹیوں میں پرائیویٹ انگریزی پڑھنے میں بہت دل لگایا۔

میرے چاچا جی لالہ امر سنگھ جین بڑوت میں رہتے تھے۔ وہاں ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ طے پایا کہ بڑوت جا کر دِگمبر جین کالج میں داخلہ لیا جائے۔ میرے چاچا جی مجھے لے کر کالج گئے۔ پرنسپل صاحب نے ہمیں ماسٹر ہریش چند جی کے پاس ٹیسٹ دینے کے لئے بھیج دیا۔ انہوں نے ایک انگریزی کی کتاب مجھے پڑھنے کے لئے دی جو میں نے فر فر پڑھ کر سنا دی اور اس کے مطلب اور معانی بھی صحیح بتا دیئے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا آٹھویں یا نویں کلاس میں داخلہ مل سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو صرف ساتویں کلاس میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ انہیں بہت تعجب ہوا۔ میں نے کہا میرا Maths کمزور ہے اس لئے اونچی کلاس میں شاید نہ چل پاؤں۔ چنانچہ ساتویں کلاس میں داخل ہوگیا۔ اب میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ کورس کی کتابوں میں دلچسپی کم اور اردو ادب میں زیادہ ہونے لگی۔ جیسے جیسے اردو شاعروں کا کلام پڑھنے کو ملتا گیا ویسے ویسے میری وارفتگی بڑھتی چلی گئی۔ کھاتے، پیتے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ہر وقت دل

ودماغ پر شعروشاعری کا جنون سوار تھا۔

کالج میں اردو اور فارسی کے دو مولوی صاحبان استاد تھے جو اردو فارسی میں بہت اچھی استعداد رکھتے تھے۔ حُسنِ اتفاق کہ ایک مولوی صاحب لائبریرین بھی تھے۔ میرے ذوق وشوق کی بہت قدر کرتے تھے۔ اردو کا بہت تھوڑا لٹریچر لائبریری میں تھا انہوں نے صرف میرے مطالعہ کے شوق کو دیکھتے ہوئے اساتذہ کے مجموعۂ کلام منگانے شروع کر دیے۔ اس زمانے میں ساغرؔ نظامی، جوشؔ ملیح آبادی، ڈاکٹر محمد اقبالؔ اور سیمابؔ اکبر آبادی کا شعروشاعری میں بہت زیادہ نام تھا۔ مولوی صاحب نے ان سبھی شاعروں کے سارے مجموعے منگوا کر مجھے پڑھوائے۔ لائبریری میں اردو میگزین بھی منگوانے شروع کئے۔ غرض یہ کہ جو بھی نئی کتاب یا رسالہ آتا مجھے بلا کر میرے نام لکھ کر مجھے دے دیتے۔ آہستہ آہستہ میرا نام کالج میں مشہور ہونے لگا۔ ہر تقریر اور جلسے میں میری نظم ضرور پڑھی جاتی۔ اور خوب داد ملتی۔ خاص طور پر مولوی صاحبان میرے کلام پر بڑھ چڑھ کر داد دیتے اور ہر طرح میری حوصلہ افزائی کرتے۔ ان کا نعرہ ہوتا اللہ کرے ذوقِ سخن اور زیادہ۔

اُسی سال مہاویر جینتی کے موقعہ پر جین سماج نے میرٹھ سے حضرت ساغرؔ نظامی کو اپنا کلام سنانے کے لئے مدعو کیا اور شام کے وقت جین دھرم شالہ میں ایک نشست منعقد کی۔ میں نے بھی ایک چھوٹی سی نظم اس موقع پر سنائی جس کو ساغرؔ صاحب نے سراہا۔ بعد میں ساغرؔ صاحب نے اپنی مشہور نظم ترنم میں پیش کی۔

ساغرؔ صاحب خوب رُو، جامہ زیب خوش گلو اور نفاست پسند شاعر تھے۔ ترنم سے جب اپنا کلام پڑھتے تھے تو ایک سماں بندھ جاتا تھا اور سامعین پر ایک پر کیف سحر سا طاری ہو جاتا تھا۔ اس روز انہوں نے اپنی ایک تازہ نظم پڑھی جس کے بندوں کے کچھ اشعار آج تک زبانی یاد ہیں۔ جیسے

چھپاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا جانِ سخن۔ اے مری جان سخن
بحرِ تکذیب کے ٹھہرے ہوئے دھارے ہیں یہ ہونٹ

یا جہنم کے دریچوں کے کنارے ہیں یہ ہونٹ
جھوٹ سے فاش نہ ہونے کی قسم لیتے ہیں
سچ کو اک آن میں الہام بنا دیتے ہیں
ان خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ حسن نظر۔ اے مرے حسنِ نظر

چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جو تہذیب کے بُت
ترشے ترشائے ہوئے آذرِ تادیب کے بُت
ان کے دل تنگ ہیں جاں سرد ہے سینے تاریک
ان کے دریا ہیں سراب ان کے سفینے تاریک
کوئی در ان پہ سیا کاریوں کا بند نہیں
جانِ ابلیس ہیں تہذیب کے فرزند نہیں
عطر آلود لباسوں پہ نہ جا روحِ گلاب۔ اے مری روحِ گلاب

اس طرف دیکھ کہ تو دیکھ کے رہ جائے گی دنگ
عہد تہذیب میں بھی آدمی ہے ننگ دھڑنگ
توشہ خانے سے غریبوں کے اڑے ہیں یہ لباس
خون نمرود کی خوشبو میں بسے ہیں یہ لباس
گنگناتی ہوئی بانہوں پہ نہ جا سازِ خیال۔ اے مرے سازِ خیال

استعارہ ہیں یہ ہیروں سے لدی ٹہنی کا
اک ستوں چاہیے اس بیل کو زر دوزی کا
فن ہو یا حسن، جوانی ہو کہ پیغامبری
ہار پڑتے نہیں مفلس کے گلے میں یہ کبھی

ساغر صاحب پڑھتے جا رہے تھے اور میں اپنی سیٹ سے اچھل اچھل پڑتا تھا۔ مجھ پر

ایک وجدان کی کیفیت سی طاری ہوگئی اور ٹھگا ٹھگا سا رہ گیا۔ اگلے روز دن میں انہیں کالج میں بھی اپنا کلام سنانے کو بلایا گیا۔ لیکن وہاں جو نظمیں انہوں نے پڑھیں وہ اتنی پر اثر نہیں تھیں۔ اس طرح میری شاعری کا سفر پروان چڑھتا چلا گیا اور اس زمانے کے شاعروں کے مختلف رنگ مجھ پر اثر چھوڑتے گئے۔ رات اور دن ہر وقت گنگناتے رہنا۔ کچھ اشعار موزوں ہوئے تو لکھ لئے۔ کچھ ایسے ہی رہ گئے۔ آٹھویں کلاس میں میرا کلام اس زمانے کے مشہور میگزین ''تیج ویکلی'' میں شائع ہونا شروع ہو گیا۔ میں اپنے پتہ میں صرف بی ایس جین جوہر جین کالج بڑوت لکھا کرتا تھا۔ مدیر محترم نے بی ایس جین جوہر پروفیسر جین کالج لکھنا شروع کر دیا۔ جب کئی بار ایسا ہوا تو کسی نے پرنسپل صاحب سے شکایت کر دی۔ اس وقت پرنسپل جناب کامتا پرشاد جین تھے۔ وہ بہت شریف النفس آدمی تھے مجھے بہت اچھی طرح جانتے تھے اور میری باتوں پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے بلا کر لعنت و ملامت شروع کر دی لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے خود کو پروفیسر نہیں لکھا تو انہوں نے مجھے پروفیسر سمجھ کر لکھنا شروع کر دیا۔ میں اگر طالب علم لکھتا ہوں تو میرا کلام ہرگز نہ چھپے گا تو وہ قائل ہو گئے اور انہوں نے کبھی اس سلسلے میں کچھ نہ کہا۔

آہستہ آہستہ میں ٹیگور، اقبال کا مرتبہ حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔ اور میرے دوست احباب بھی مجھے ایک ہونہار شاعر کے روپ میں دیکھنے لگے۔ لیکن ایک بڑی دقت میرے سامنے تھی۔ میں جب شعر کہتا تھا تو کئی روز اس کو گنگناتا ہوا اس کا لطف اٹھاتا تھا۔ بعد میں دو چار روز میں مجھے خود کچھ فنی نقائص نظر آنے لگتے تھے اور میں بہت بے چین اور پریشان ہو جاتا تھا۔ اس طرح میرے ذوق کی تسکین نہ ہو پاتی تھی۔ دماغ میں یہ خیال بڑے زور سے اٹھتا کہ کسی کو اپنا صلاح کار بنایا جائے۔ ایک روز میں نے اپنی ایک نظم بڑے مولانا صاحب کو دھڑکتے ہوئے دل سے برائے اصلاح دی۔ انہوں نے دو تین روز اپنے پاس رکھ کر مجھے لوٹا دی بولے بھئی، ہم شعروں کے حسن و قبح کو پرکھ سکتے ہیں لیکن اصلاح دینا ہمارے بوتے کی بات نہیں۔ تم کسی بڑے شاعر کی شاگردی اختیار کرو اور ان سے اصلاح لو تو تب تمہارے فن کو جلا ملے گی۔

© جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : بی۔ایس۔جین جوہر: فن اور شخصیت
ناشر و مصنّف : ڈاکٹر خالد حُسین خاں
صدر شعبۂ اردو، میرٹھ کالج، میرٹھ (چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)
سمن زار، 27/10، شاستری نگر، میرٹھ-250003
(موبائل:09358285859, 09412207114)

سنِ اشاعت : 2007
قیمت : -/200
کمپوزنگ : ظفر گلزار، میرٹھ
سرورق : انعم آرٹس، دہلی
طباعت : ہندوستان آفسیٹ پریس، نئی دہلی

زیرِ اہتمام
تنویر احمد

ملنے کے پتے :

☐ **ڈاکٹر خالد حسین خاں**
27/10، شاستری نگر، میرٹھ-250003 موبائل: 09358285859, 09412207114

☐ **بی ایس جین جوہر**
B-7، انڈسٹریل اسٹیٹ، پرتاپور میرٹھ فون:0121-244077 موبائل:9358400900

☐ **سمراٹ بک ڈپو**
چوکی انجان، شاہجہان پور-242001 فون: 05842-234373, 222653

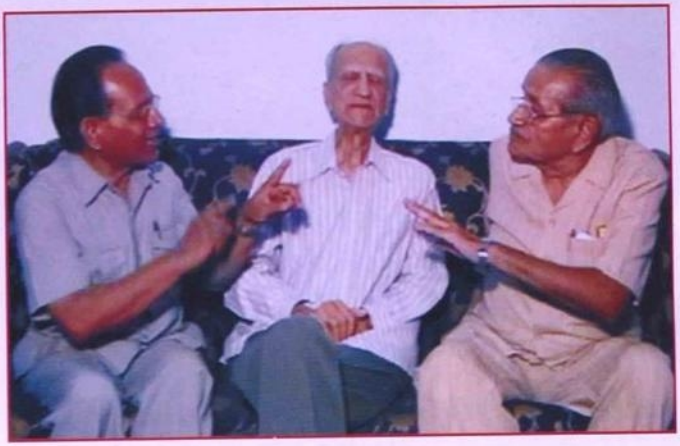

بی ایس جین جوہر، مظہر امام اور ڈاکٹر خالد حسین خاں
آزاد غزل پر باہمی گفت وشنید میں مصروف

بی ایس جین جوہر، ڈاکٹر خلیق انجم (جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی
اور ڈاکٹر خالد حسین خاں، ڈاکٹر خلیق انجم کے ساتھ

ڈاکٹر خالد حسین خاں، بیگم وڈاکٹر خلیق انجم اور بی ایس جین جوہرؔ،
ڈاکٹر خلیق انجم فنِ شاعری پر باہمی تبادلہء خیال کرتے ہوئے

بی ایس جین جوہرؔ، بیگم وڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر خالد حسین خاں،
خلیق انجم کی رہائش گاہ غازی آباد میں چائے کا لطف لیتے ہوئے

بی ایس جین جوہر، پروفیسر قمر رئیس اور ڈاکٹر خالد حسین خاں ایک ادبی نشست میں

ڈاکٹر خالد حسین خاں، بی ایس جین جوہر اور رفعت سروش شعری نشست میں

بی ایس جین جوہرؔ، مخمورؔ سعیدی اور ڈاکٹر خالد حسین خاں محوِ گفتگو

پاپولرؔ میرٹھی (شاگردِ رشید، خالد حسین خاں)، ڈاکٹر خالد حسین خاں اور بی ایس جین جوہرؔ

مرتبِ کتاب کے دولت کدے پر

(دائیں سے) شری بی ایس جین جوہر، پروفیسر ایس پی اوجھا (وائس چانسلر، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)، جناب ممتاز عرشی (ہائر ایجوکیشن آفیسر، میرٹھ اور سہارنپور) اور ڈاکٹر خالد حسین خاں (صدر شعبہء اردو، میرٹھ کالج، میرٹھ)

بی ایس جین جوہر اپنے عزیز دوست شری سریندر پرکاش جین (دہلی) کے ساتھ

(دائیں سے) شری بی ایس جین جوہر، پروفیسر ایس پی اوجھا (وائس چانسلر، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ) اور ڈاکٹر خالد حسین خاں (صدر شعبہء اردو، میرٹھ کالج، میرٹھ)

(دائیں سے) جناب ممتاز عرشی (ہائر ایجوکیشن آفیسر، میرٹھ اور سہارنپور)، بی ایس جین جوہر اور ڈاکٹر خالد حسین خاں (صدر شعبہء اردو، میرٹھ کالج، میرٹھ)

ڈاکٹر خالد حسین خاں (صدر شعبۂ اُردو میرٹھ کالج اور کنوینر مشاعرہ و رسمِ اجراء ترانۂ بیداری)
شری بی۔ایس۔جین جوہر کو مومنٹو دیتے ہوئے۔ساتھ میں جناب رفعت سروش بھی ہیں۔

''ترانۂ بیداری'' کے رسمِ اجراء کے موقع پر: (دائیں سے) ڈاکٹر ممتاز عرشی (ریجنل ہائیر ایجوکیشن آفیسر)، شری رام کرشن (ڈی۔ایم۔میرٹھ)، شری یوگیش بنسل (صدر منتظمہ کمیٹی میرٹھ کالج)، ڈاکٹر ایس۔کے۔اگروال (پرنسپل میرٹھ کالج)، جناب رفعت سروش۔عقب میں شری بی۔ایس۔جین جوہر اور ڈاکٹر خالد حسین خاں (صدر شعبۂ اردو میرٹھ کالج اور کنوینر پروگرام)

میرٹھ کالج، میرٹھ کے تاریخی منگل پانڈے سبھا گار میں
'ترانۂ بیداری' کے رسمِ اجراء پر بی ایس جین جوہرؔ اظہارِ خیالات کرتے ہوئے۔

شری بی ایس جین جوہرؔ اور ڈاکٹر خالد حسین خاں (مرتبِ کتاب)

''ترانۂ بیداری'' کے رسمِ اجراء پر (دائیں سے) ڈاکٹر ممتاز عرشی، شری رام کرشن (ڈی۔ایم۔میرٹھ)، شری یوگیش بنسل (صدر منتظمہ کمیٹی میرٹھ کالج) ڈاکٹر ایس۔کے۔اگروال (پرنسپل میرٹھ کالج) جناب رفعت سروش، ڈاکٹر خالد حسین خاں (صدر شعبۂ اُردو) اور عقب میں شری بی۔ایس۔جین جوہرؔ

انتساب

والدِ مرحوم

محترم قاری، حافظ، الحاج حمید اُللہ خاں صاحب، مہمندی

کی یاد میں

اپنی شریکِ حیات

راشدہ خاتون

اور فرزندِ سعادت مند

خان کامران خالد

و دُخترِ خوش بخت

سَمن خالد

کے نام

شری پی۔پی سریواستوا رِند، شری بی۔ایس۔جین جوہر اور ڈاکٹر خالد حسین خاں

شری بی۔ایس۔جین جوہر اور ڈاکٹر خالد حسین خاں

شری بی ایس جین جوہرؔ اپنی اہلیہ شریمتی سُپلا جین کے ساتھ

بی ایس جین جوہرؔ اپنی اہلیہ سُپلا جین، بیٹے گُن کمار جین، بہو اور پوتے پوتیوں کے ساتھ

(دائیں سے بائیں) منوہر لال جین، آنند سنگھ جین، بیرسین جین، بی ایس جین جوہر
اور اندر سین جین (برادران)

(دائیں سے بائیں) منوہر لال جین (عقب میں ان کی اہلیہ)، آنند سنگھ جین (عقب میں ان کی
اہلیہ)، بیرسین جین (عقب میں ان کی اہلیہ)، بی ایس جین جوہر (عقب میں ان کی اہلیہ)
اور اندر سین جین (عقب میں ان کی اہلیہ)

لائنس کلب، میرٹھ کے عہدیداران شری بی ایس جین جوہرؔ کو اعزاز سے نوازتے ہوئے۔
ساتھ میں پُنن کمار جین (صاحبزادے)

شری سریندر پرکاش جین، دہلی (عزیز دوست) بی ایس جین جوہرؔ کو شال اُڑھاتے ہوئے

شری بی ایس جین جوہرؔ (عہدِ جوانی میں)

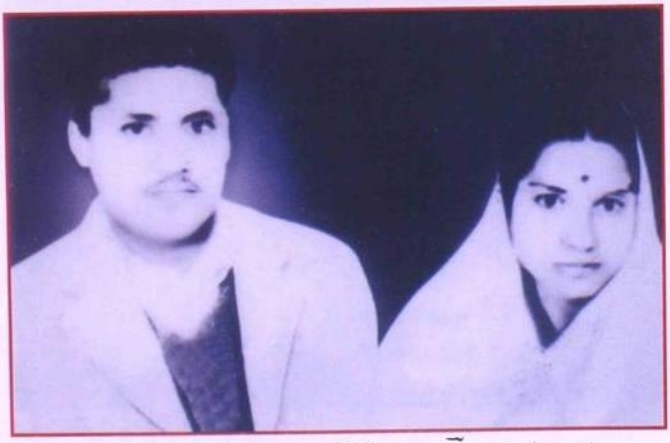

شری بی ایس جین جوہرؔ اپنی اہلیہ شریمتی سُپلا جین کے ساتھ (عہدِ جوانی میں)

میں نے علامہ سیماب اکبرآبادی جو اس زمانے کے استاد شاعر تھے کو اپنی ایک دو نظمیں اور غزلیں بھیج کر ان سے اپنی شاگردی میں لینے کی درخواست کی جو انہوں نے منظور کر لی اور مجھے لکھا 'صاحبزادے اگر تمہارا ذوق وشوق اسی طرح برابر پروان چڑھتا رہا تو ایک دن ہندوستان کے نامور شعرا میں تمہارا نام ہو سکتا ہے۔ پھر کیا تھا میرا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ اس زمانے کے اتنے بڑے شاعر کا سرٹیفکیٹ میرے لئے بہت کافی تھا۔ میں نے اور تیزی سے لکھنا شروع کر دیا۔

لیکن قسمت میں تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔ اسی دوران میرے والد صاحب کو میری اس دیوانگی، کی پوری تفصیل سے خبر ملی۔ انھوں نے زبانی کچھ نہ کہہ کر ایک لمبا چوڑا خط مجھے لکھ بھیجا جس سے میری زندگی کا نقشہ ہی پلٹ گیا۔ انہوں نے لکھا تم ہمارے خاندان کے چشم و چراغ ہو۔ تم سے خاندان کی ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ تم جس راہ پر چل رہے ہو اس سے تمہارا وہی حشر ہوگا جو اردو کے ہر شاعر کا ہوتا ہے۔ یعنی فاقہ مستی اور گھر والوں کا تو بس بھگوان مالک ہے۔ تم وہاں تعلیم حاصل کرنے گئے ہو شاعری کرنے نہیں وغیرہ وغیرہ۔ پڑھ کر سکتے میں آ گیا۔ میں والد سے بہت ڈرتا تھا۔ ان کی ناراضگی کسی بھی صورت میں گوارا نہ تھی۔ ان کی دلیل میں دم بھی تھا۔ اس لئے لاجواب ہو گیا۔ اور اندر ہی اندر گھٹنے لگا۔ شعر و شاعری کرنا تو ایسا لگنے لگا، جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں۔ جس کو اپنی زندگی کا واحد مقصد سمجھتا تھا وہ اب ''لکا چھپی'' کا مشغلہ بن کے رہ گیا۔ باقاعدہ روزانہ لکھنا بند کر دیا۔ جو اشعار چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اور گنگناتے ہوئے موزوں ہو جاتے تھے، کچھ نوٹ ہو جاتے، کچھ ایسے ہی رہ جاتے تھے۔ ایک دن دکھی ہو کر میں نے لکھا:

اس دل میں موجزن ہے جذبات کا سمندر
تھامے نہیں تھمیں گی ایسی روانیاں ہیں

مشاعروں میں شریک ہونے سے ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں والدین کو پتا لگ گیا تو کیا حشر ہوگا۔ ایک بار دوسرے کالج میں مشاعرہ تھا۔ ہمارے مولوی صاحبان مجھے وہاں بہت اصرار کر کے لے گئے۔ کیونکہ میں ہی ان کے پاس جیتنے والا مہرہ تھا۔ میں نے جب اپنی نظم 'ایام طفلی' پڑھی تو

سماں بندھ گیا۔ جس کے بول تھے۔

ہائے وہ ایام طفلی کی بہاریں کیا ہوئیں
جن میں میرے بچپنے کی نرم کلیاں وا ہوئیں

لگتا تھا جیسے سب کو اپنا بچپن یاد آ گیا ہو، میری عمر صرف چودہ سال اور آٹھویں کلاس کا طالب علم۔ لوگ سن کر حیران رہ گئے۔ اور ہمارے مولانا تو لٹو ہو گئے۔ اس زمانے میں صرف طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے اور اس طرح کی نظم ایک خوشگوار تبدیلی تھی جس کو بہت سراہا گیا۔ مولانا صاحب کو تو یہ محسوس ہوا کہ جیسے ان کی طرز تعلیم کو ہی داد مل رہی ہے۔

میٹرک پاس کر کے میں نے میرٹھ کالج میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں بھی اردو بی اے تک میرا مضمون رہا اور کافی اچھی استعداد پیدا ہو گئی۔

میرٹھ کالج میں اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ سمیت کل اٹھارہ سو طالب علم ہوا کرتے تھے۔ پرنسپل مسٹر چٹرجی تھے۔ صبح کو روزانہ پرارتھنا ہوا کرتی تھی۔ میں نے ریلوے روڈ پر واقع جین بورڈنگ ہاؤس میں داخلہ لے لیا تھا اور وہاں سے سائیکل پر کالج جایا کرتا تھا۔ میرٹھ کا یہ حال تھا کہ سڑکیں سونی پڑی رہتی تھیں۔ پورے شہر میں کل چار پانچ موٹر کاریں تھیں۔ ہمارے بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ انٹر کالج میں پروفیسر تھے۔ صبح جب کالج جاتے تھے روڈ پر ایک طرف چلتے ہوئے ہندوستان ٹائمز کا تازہ شمارہ پیدل پڑھتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ ٹریفک سے کوئی پریشانی نہ ہوتی تھی۔ سڑک پر سائیکل اور گھوڑے تانگے کے سوا کوئی سواری نہ چلتی تھی۔ سڑک پر حادثہ کوئی نہ ہوتا تھا۔ میرٹھ سے دہلی دو چار پرائیویٹ بسیں آتی جاتی تھیں اور آج وہی میرٹھ ہے اور وہی سڑکیں۔ روزانہ ٹریفک جام رہتا ہے اور ایک دو حادثے روز ہو جاتے ہیں۔ کئی جانیں چلی جاتی ہیں۔ خیر یہ تو ایک الگ موضوع ہے۔

دوسری عالمی جنگ چل رہی تھی۔ چاروں طرف معاشی تنگی کا دور دورہ تھا۔ ایسے وقت میں سرکار نے ایک عالمی مشاعرہ کا اہتمام کیا جس کا اہتمام نواب باغپت جناب جمشید علی خاں

صاحب کے سپرد تھا۔ جو سرکار کے بہت اہم خیر خواہوں میں تھے۔ گورنمنٹ انٹر کالج کے میدان میں یہ مشاعرہ دو روز تک چلا۔ ہندوستان کے مشہور شعرا میں سے کوئی بھی شاعر ایسا نہ ہوگا جو اس مشاعرے میں شامل نہ ہوا ہو۔ پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس زمانے میں شاعر انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی کا بول بالا تھا۔ سب شاعر پنڈال میں موجود تھے اور مشاعرہ اپنے پورے شباب پر تھا کہ جوشؔ صاحب پنڈال میں داخل ہوئے اور جیسے ہی انہوں نے اندر قدم رکھا سارا پنڈال 'شاعر انقلاب زندہ باد' کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا۔ میں نے ان کو پہلی بار دیکھا تھا۔ سرخ وسفید پٹھانوں والا رنگ، چہرے پر شباب کی تمتماہٹ اور خوش پوشی کا ایک الگ ہی رعب سا تھا۔ تھوڑی دیر ایک دو شاعروں کو سن کر انہوں نے ناظم مشاعرہ سے اصرار کیا کہ مجھ سے پہلے سن لیا جائے۔ لہٰذا ان کا نام لیا گیا اور انہوں نے اپنی ایک نظم 'جولان گہہ ادبار میں جاؤں کہ نہ جاؤں' تحت اللفظ بلند آواز میں سنائی اور سماں بندھ گیا۔

اگلے روز میرٹھ کالج ہال میں حضرت جوشؔ ملیح آبادی اور مجازؔ لکھنوی کو بلایا گیا دونوں نظم کے شاعر تھے۔ جوشؔ صاحب نے کون سی نظم سنائی یہ تو اب یاد نہیں لیکن مجازؔ صاحب نے اپنی وہ مشہور زمانہ نظم ''آوارہ'' پڑھی جس کے بول تھے۔

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں
اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں.....
جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں

ہاں اس روداد میں ایک واقعہ بیان کرنا باقی رہ گیا۔ ایک بار معلوم ہوا کہ علامہ سیماب صاحب دلی کے کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے آگرہ سے آرہے ہیں۔ چنانچہ میں بھی دلی پہنچا وہاں لکشمی ہوٹل (یا ریسٹورنٹ) میں شام کے وقت ان سے ملا۔ بہت شفقت سے ملے۔ رات کو ان کے ساتھ مشاعرے میں شرکت کی۔ مشاعرہ بازار سیتا رام میں کسی جگہ پر منعقد ہوا تھا۔ علامہ کو اس مشاعرے میں کافی عزت دی گئی۔ مجھے تو بس پہلا اور آخری شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ باقی پورا رابطہ خط و کتابت سے ہی رہا۔ علامہ کے یہاں ڈاک کا بہت معقول انتظام تھا۔ آٹھ دس روز میں عام طور سے اصلاح شدہ کلام واپس مل جاتا تھا۔ لیکن زندگی بھر یہ افسوس رہا کہ ان کا اور یجنل اصلاح شدہ کلام محفوظ نہ رکھا۔ بلکہ اس اصلاح شدہ نظم یا غزل کو بیاض میں نقل کر کے ایسے ہی لڑکپن کی لاپرواہی سے تلف ہو جانے دیا۔ کاش یہ اصلاحیں محفوظ رکھی گئی ہوتیں تو آج شاعروں کی نئی نسل کے بہت کام آتیں۔ ایسے استاد آج اردو شاعری کو کہاں نصیب ہیں۔

میرٹھ کالج کی تعلیم کے دوران دوسرے علوم میں بھی میری بہت دلچسپی ہو گئی۔ خاص طور پر انگلش لٹریچر کا پورا ذوق رہا۔ کالج کی لائبریری سے انگریزی مصنفین اور شاعروں کی کتابیں لے کر پڑھتا رہا۔ شکسپیئر، ورڈس ورتھ، ٹینی سن، شیلے اور دیگر تمام انگریزی شعرا کا کلام پڑھا۔ چارلس ڈیکنز کے سارے ناول اور دوسرے بڑے لکھنے والوں کی کتابوں سے مستفیض ہوا۔ انگلش لٹریچر بھی میرا سبجیکٹ تھا۔ پالیٹکس میں بھی کافی دلچسپی بڑھ گئی۔ کارل مارکس کی مشہور کتاب Das Capital کا بھی کافی مطالعہ کیا جس کی اقتصادیات کو سمجھنا کافی مشکل تھا۔ میرٹھ کی مشہور لائبل لائبریری کا بھی برابر ممبر رہا۔ جس میں سارے اردو میگزین آتے تھے۔ انگلش اور اردو لٹریچر کا کافی بڑا ذخیرہ تھا جس سے بہت فیضیاب ہوا۔ روزانہ لائبریری جا کر دو گھنٹہ پڑھتا تھا اور کتابیں لے کر آتا تھا۔ اردو سے برابر لگاؤ رہا۔

میرٹھ میں ایک اسٹڈی سرکل کے نام سے کمیونسٹوں کا ایک دفتر تھا جس میں روزانہ کچھ

ترتیب

پیغامات

پیغامِ وزیرِ اعظمِ ہند		9
پیغامِ محمد حسن گھانوی ایڈووکیٹ		10
پیغامِ ڈاکٹر بشیر بدر		11
پیغام ڈاکٹر خلیق انجم		12
پیغامِ رئیس صدیقی		14
گفتنی	: پروفیسر خالد حسین خاں	15
گذارشِ احوالِ واقعی	: بی ایس جین جوہر	39

مضامین

سیماب اکبرآبادی کا ایک شاگرد: بی۔ایس۔جین جوہر	: مظہر امام	58
جین جوہر کی شاعری 'ترانۂ بیداری' کی روشنی میں	: پروفیسر عبدالقوی دسنوی	61
'ترانۂ بیداری'....از بی ایس جین جوہر	: پروفیسر صغریٰ مہدی	72
جوہر شناسی	: رفعت سروش	75
جوہر اپنے مجموعۂ کلام 'ترانۂ بیداری' کی روشنی میں	: پروفیسر خالد حسین خاں	78
نذرِ جوہر	: ڈاکٹر یونس غازی	85
جوہر کی شاعری 'ترانۂ بیداری' کی روشنی میں	: ڈاکٹر محمد اسلم، بھیڑی	86

لوگ آ کر بیٹھتے تھے اور سیاسی معاملوں پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ میرا بھی رجحان کچھ کمیونزم کی طرف ہو گیا تھا۔ وہاں پر کمیونسٹ لٹریچر بہت آتا تھا اور پڑھا جاتا تھا۔ لیکن عالمی جنگ میں کانگریس نے برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کی ادھر کمیونسٹوں نے سرکار کی حمایت کی کیونکہ انہوں نے اسے People's War قرار دیا۔ اس جنگ میں برطانیہ امریکہ اور روس شانہ بشانہ لڑ رہے تھے اور کمیونسٹ روس کے ساتھ تھے۔ کانگریس کا کہنا تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان کو جنگ میں غلام ملک کی حیثیت سے لپیٹ رکھا ہے۔ ہندوستان کو ان کی جیت سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اس لئے ہم برطانیہ کا ساتھ کیوں دیں۔ دونوں میں اختلاف رائے بڑھتا چلا گیا اور کانگریس نے کمیونسٹوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ میں بھی اس سلسلے میں اس سرکل سے الگ ہو گیا۔ اس میں جناب شانتی تیاگی جو بعد میں ایم پی بھی ہوئے، سربراہ تھے۔

اس زمانے کا ایک اور واقعہ جو ذاتی طور پر مجھ سے متعلق ہے قابل ذکر ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے فائنل امتحان چل رہے تھے۔ لیکن میں اپنی شعر و شاعری میں محو تھا۔ اردو کا ایک پرچہ میں دے چکا تھا۔ جس دن دوسرا پرچا تھا اس دن بالکل بھول گیا کہ آج اردو کا دوسرا پیپر ہے اس لیے غیر حاضر ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ میں نے اپنے آپ کو امتحان میں فیل سمجھ لیا لیکن کسی سے بھی ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ باوجود میری خود فراموشی کے میں پھر بھی ایک اچھا ہوشیار طالب علم سمجھا جاتا تھا اور میرا فیل ہونا بہت تعجب کی بات تھی اور میرے لئے ذاتی طور پر ایک بہت بڑا صدمہ۔

مگر جب رزلٹ آیا تو میں پاس ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اردو کے پہلے پرچے میں ہی میرے پچاس میں سے پنتالیس نمبر آئے تھے۔ تب کہیں جان میں جان آئی۔ لیکن افسوس بھی رہا کہ اگر دوسرے پرچے میں بھی پینتالیس نمبر آ جاتے تو میری کتنی اچھی پوزیشن بن جاتی۔

کالج میں پڑھتے پڑھتے میرا سابقہ اپنے ایک دور کے رشتہ دار سے پڑا۔ وہ ایک اچھے کاروباری آدمی تھے۔ وہ ایک نیا کام کرنے والے تھے جس میں وہ مجھے بھی ساتھ لینا چاہتے تھے کیونکہ وہ بھی میری ذہانت کے قائل تھے۔ بہت دنوں تک وہ ہوسٹل میں آتے جاتے رہے اور

مجھے اپنے ساتھ کاروبار میں ڈالنے کی باتیں کرتے رہے۔ادھر میرے پاس بی اے کرنے کے بعد کوئی اچھی تجویز نہ تھی۔ پہلے سوچا ایک پرنٹنگ پریس کھول کر اپنا کوئی اردو کا اخبار نکالا جائے لیکن اس میں نہ کوئی ساتھی ملا، نہ صلاح کار۔اس لئے بی اے کرتے ہی انہیں کے ساتھ کاروبار میں لگ گیا۔یہ وہ راستہ تھا جس سے واپسی کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ مجھے مکینکل انجنئرنگ کا شوق ہوگیا اور مشین ڈیزائن سے بہت رغبت ہوگئی۔دماغ میں نئی نئی مشینوں کے ڈیزائن گھومنے لگے اور انہیں بنانے کے لئے کوشش کرنے لگا۔جس میں کافی کامیابی ملنی شروع ہوگئی۔کیونکہ مشین تصور میں ہی اصلیت میں بننے سے پہلے ہی آجاتی تھی۔

مشکل یہ رہی کہ کارخانے میں لاگت بہت زیادہ آتی تھی اور اپنے گھر کا کوئی بھی فرد اس کام میں آنے کے لئے تیار نہ تھا اس لئے باہر کے لوگوں سے شرکت کرنی پڑتی تھی۔اور برسوں تک کبھی کسی کے ساتھ اور کبھی کسی دوسرے کے ساتھ ساجھا جوڑنا پڑتا تھا۔پھر علیحدگی ہوجاتی تھی اور اس میں بہت نقصان ہوجاتا تھا۔

اس دوران مئی ۱۹۴۸ء میں میری شادی شریمتی سپلا جین سے ہوگئی۔میری رفیقۂ حیات ایک پڑھی لکھی اور سلیقہ مند گھریلو عورت ہیں۔جن سے مجھے ہمیشہ ہر کام میں سہیوگ ملا۔سب سے بڑی خوبی یہ رہی کہ مجھے گھر کے کسی کام کے لئے تکلیف نہیں دی اور نہ کوئی گھریلو مسئلہ میرے سامنے رکھا۔یہاں تک بچّے کی پرورش اور پڑھائی لکھائی کا ذمہ بھی انہوں نے اپنے پر لیا۔جس سے مجھے دو متوازی زندگی جینے کا موقع ملتا رہا۔ایک کاروباری اور دوسری علمی اور ادبی زندگی۔اور دونوں کو میں بخوبی نبھا تا رہا ہوں صرف انہیں کے سہیوگ سے۔کئی بار زندگی میں ایسے مراحل بھی آئے جب بزنس میں بہت نقصان اُٹھائے اور ایسا لگا کہ بہت جلد فیل ہوجائیں گے لیکن انہوں نے اپنی کفایت شعاری، حوصلے اور ہمّت سے کام لے کر ان سب مشکلات سے ابھارا۔اگر میں اپنی پچھلی زندگی کے پچاس برسوں کا احاطہ اس مضمون میں کرنے لگوں تو قاری کو جمہائیاں آنے لگیں گی۔نہ ہی اس مضمون کا یہ مقصد ہے لیکن ان سارے برسوں کی کاوشوں کا نچوڑ تو دینا ہی

پڑے گا۔ میں نے ہمیشہ شرکت میں کاروبار کیا۔ اور کئی بار نقصان اٹھائے۔ کیونکہ کچھ برسوں کے بعد کہیں نہ کہیں آپس میں دراڑ پڑ جاتی تھی اور علیحدگی کی صورت میں مجھے نقصان اٹھانا پڑتا تھا، کیونکہ میں اپنی فطرت میں بہت سیدھا سادہ انسان رہا ہوں۔ حساب کتاب کی طرف زیادہ دھیان کبھی نہیں دیا۔ ہمیشہ اپنے سے زیادہ دوسروں کے مفاد کا خال رکھا۔ ٹیکنیکل کام میں لگا رہتا تھا۔ جس کا فائدہ دوسرے حصہ دار اٹھاتے تھے۔ بہر حال برسوں تک ساجھے میں کام کر کے جو تجربے حاصل ہوئے ان کا نچوڑ درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ اپنے سے بڑی مالی حیثیت والے کے ساتھ ساجھا نہیں کرنا چاہئے۔ دوسرے فرم پر اپنی ذاتی حیثیت سے زیادہ قرض نہ لیا جائے۔ تیسرے یہ کہ حساب کتاب پر پوری توجہ دینا ضروری ہے، چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ علیحدگی کی صورت میں اپنی مالی حالت اتنی مضبوط ہو کہ پوری فرم کو اپنی طرف کر سکیں اور دوسرے ساجھے دار کو الگ کیا جا سکے ورنہ بھاری نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے۔

انہیں سب پریشانیوں سے تنگ آ کر ۱۹۶۸ء میں اپنا نجی کاروبار قائم کیا۔ تکلیفیں تو اس میں بھی بہت اٹھائیں اور نقصان بھی ہوئے لیکن آخر کامیابی ملی اور بازار میں Good will قائم ہو گئی اور Product Quality بھی مشہور ہو گئی۔

ادھر میرے بیٹے نمن کمار جین نے بی ایس سی پاس کر کے کارخانے میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اور میرے تجربے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کاروبار میں مہارت حاصل کر لی۔ آہستہ آہستہ انہوں نے پورا کام سنبھال لیا اور مجھے فراغت ملنے لگی۔ اور بزنس سے بے فکری ہو گئی۔

میں دوبارہ شعر و شاعری کی طرف زیادہ رجوع ہو گیا ہوں اور بقول غالبؔ ۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

تو صاحب یہ ہے میری زندگی کی مختصر کہانی کسی کے کچھ کام آ جائے تو زہے نصیب۔

اب میں آپ سے وداع ہوتا ہوں جوشؔ ملیح آبادی کی اس رباعی کے ساتھ ۔

اطراف وجہات کو مرتب کر لے
رودادِ حیات کو مرتب کر لے
اس سے پہلے کہ بھول جائے سب کچھ
یادوں کی برات کو مرتب کر لے

○○

B. S. Jain Jauhar
Industrial Estate, Partapur, Meeurt
Mobile : 09358400900

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

مضامین

○ مظہر امام

سیماب اکبرآبادی کا ایک شاگرد: بی۔ایس۔جین جوہر

بکرم سین جین جوہر (معلوم نہیں وہ اپنا نام بی۔ایس۔جین جوہر کیوں لکھتے ہیں) مجھ سے عمر میں ایک سال اور دو مہینے بڑے ہیں۔ انھوں نے اپنے وقت کے مشہور جریدے ''تیج'' ویکلی میں اس وقت چھپنا شروع کیا جب وہ آٹھویں کلاس میں پڑھ رہے تھے اور عمر یہی کوئی چودہ سال تھی۔ (دوستوں کو یقین نہیں آتا کہ میں نے آزاد غزل کا تجربہ سترہ سال کی عمر میں کیا جب میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ عمر تجربہ کرنے کی نہیں ہوتی، ناموزوں اشعار کہنے کی ہوتی ہے!) بکرم سین جوہر ٹیگور اور اقبال کا مرتبہ حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ انھوں نے اوائل عمری میں ہی سیماب اکبرآبادی کو اپنی چند چیزیں ارسال کیں اور درخواست کی کہ انھیں اپنی شاگردی میں لے لیں۔ علامہ سیماب نے نہ صرف یہ کہ یہ درخواست منظور کی بلکہ کام سے متاثر ہو کر انھیں لکھا کہ اگر تمھارا ذوق وشوق اسی طرح قائم رہا تو ایک دن تمھارا شمار ملک کے نامور شعرا میں ہوگا۔ مگر قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ والد کو ان کے اس شوق کی خبر ملی تو انھیں بہت سمجھایا کہ شعر وشاعری کرنے والوں کا حشر مفلسی اور فاقہ مستی کے سوا کچھ نہیں، اس لیے تم اس شوق فضول سے دست بردار ہو جاؤ اور اپنا آبائی پیشہ تجارت اختیار کرو۔ بی اے تک جوہر نے اُردو اور انگریزی کے اعلیٰ ادب کا مطالعہ خشوع وخضوع کے ساتھ کیا۔ انھوں نے بی اے کی تعلیم ۱۹۴۷ء میں مکمل کی۔ انگریزوں کی غلامی سے بھی اسی سال ہمیں نجات ملی، لیکن ۱۹۴۸ء میں جوہر کے پاؤں میں شادی کی بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ عملی زندگی کی ذمہ داریاں ان کے سامنے تھیں۔ بادلِ ناخواستہ شعر گوئی سے اپنا ناطہ توڑنا پڑا۔ لیکن چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ لہٰذا کبھی کبھی شعر کی دیوی کے حضور سربسجود ہو جاتے، لیکن اصل توجہ اپنے پیشے کی طرف رہی۔ ٹیگور اور اقبال بننے کی خواہش دل ہی میں رہ گئی، سیماب کی پیشین گوئی کو بھی وہ سچ ثابت نہ کر سکے۔

عمر کے آخری پڑاؤ میں، جب بکرم سین جوہر کے صاحبزادے نے پورا کاروبار سنبھال لیا ہے اور انھیں ''کارِ جہاں'' سے فراغت مل گئی ہے تو وہ پھر ''کارِ جاناں''، یعنی شاعری کی طرف راغب ہوئے ہیں اور انھوں نے اپنے کلام کا مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' کے نام سے پیش کیا ہے۔

بی ایس۔ جین جوہر کا یہ مجموعہ دیکھ کر مجھے حیرت آمیز مسرت ہوئی۔ اس مجموعے میں نظمیں، غزلیں، قطعات اور دوہے شامل ہیں۔ نظموں کی تعداد زیادہ ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جوہر، دراصل نظم کے شاعر ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب جوش، حفیظ، سیماب، احسان دانش اور اختر شیرانی کا طوطی بولتا تھا۔ یہ سب نظم کے بلند مرتبت شاعر تھے۔ میں نے بھی ان سب کا مطالعہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں پورے انہماک کے ساتھ کیا تھا۔ جوہر میرے ہم عمر اور ہم عصر ہیں اور یقین ہے کہ ان کے مطالعے میں بھی بطور خاص یہی شعرا رہے ہوں گے۔ جوہر کی نظم نگاری انھیں شعرا کی بہترین خصوصیات کی یاد دلاتی ہے۔ اب یہ رنگِ سخن مطبوع نہیں رہا۔ نظم کا وہ آہنگ، وہ اسلوب اور وہ طرزِ اظہار بدل گیا ہے جو ایک زمانے میں ہم سب کو خوش آتا تھا۔ لیکن میرا یقین ہے کہ اُردو شاعری کا کوئی سنجیدہ قاری ان اہم نظم نگاروں سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔ جوہر کی شاعری کا مطالعہ بھی ان شعرا کے مزاج، رنگِ اظہار اور موضوعاتِ سخن کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ کم عمری میں ہی جوہر کو زبان و بیان پر جو قدرت حاصل ہوگئی تھی اور فکر و تخیل میں جو صلابت آ گئی تھی، وہ کسی کے لیے بھی قابلِ رشک ہوسکتی ہے۔ میں اسی شعری پس منظر کا پروردہ ہوں۔ اس لیے بی۔ ایس۔ جین جوہر کی شاعری کا تحسینی محاکمہ کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ ان کی ایک نظم ''حسن اور سرمایہ داری'' کے یہ اشعار دیکھئے:

سرخیاں سی دوڑ جائیں گرم رخساروں میں یوں
جوش سے جیسے نگاہوں میں اُتر آتا ہے خوں

مسکراتی ہے دیہاتوں میں حقیقی زندگی
ہے جہاں چھایا ہوا اِک جذبۂ وارفتگی

وہ نسیم صبح ، وہ دریا کا انداز خرام
ایک ایثار مجسم اور اِک نازِ تمام

والہانہ کیفیت سی ہر طرف چھائی ہوئی
دوش فطرت پر ہے زلف ابر لہرائی ہوئی

وہ رہٹ کی خوشگوار آواز، وہ ہتّاں کا راگ
گیت گاتا ہے خوشی کے ان مناظر کا سہاگ

جو شاعر نظم پر ایسی دسترس رکھتا ہو، اس کے لیے غزل کہنا اور غزل میں اچھے اشعار نکال لینا زیادہ دُشوار نہیں۔ جوہر بنیادی طور پر غزل کے شاعر نہیں ہیں، لیکن دیکھئے۔ اس صنف میں بھی کیسے کیسے اشعار نکالنے پر قادر ہیں۔ صرف حسنِ اظہار ہی نہیں، فکر کی نیرنگیاں بھی دیکھئے:

سب کے سب دوش میں ہیں سیلاب غم زیست کے ساتھ
کوئی ٹھہرا ہو تو رفتار نظر آتی ہے

لڑکھڑا جاتے ہیں دھرتی کے قدم گاہ بگاہ
جب بہکتی ہے تو مے خوار نظر آتی ہے

یہ مثالیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ میں نے اس کا خیال رکھا ہے کہ وہ اشعار نہ دہراؤں جو رفعت سروش کے دیباچے میں آپ کو ملیں گے۔ انھوں نے ''ترانۂ بیداری'' پر جو مقدمہ لکھا ہے، وہ جوہر کی شاعری پر حرف آخر کا حکم رکھتا ہے۔ رفعت سروش کی شعر گوئی اور شعر فہمی کا میں ہمیشہ سے قائل ہوں۔ انھوں نے جوہر کی شاعری کا مطالعہ صحیح تناظر میں کیا ہے اور اپنے تنقیدی نتائج ان کی شاعری سے ہی اخذ کئے ہیں۔

''ترانۂ بیداری'' کی بیشتر نظمیں ۱۹۴۳ء تک یعنی سولہ سال کی عمر تک کہی جا چکی تھیں۔ ایک دو نظمیں ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ء کی بھی ملتی ہیں۔ غزلوں، قطعات اور دوہوں پر سنہ تخلیق درج نہیں ہے۔ قیاس ہے کہ وہی بعد کے اوقات میں ''چوری چھپے'' کہی گئی ہوں گی! اور اب جوہر نے اپنا پورا سرمایہ بلا جھجک سب کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

OO

Mazhar Imam
176-B, Pocket-I, Mayur Vihar, Phase-1, Delhi-91
Phone : 011-22756049, 55818283

○ پروفیسر عبدالقوی دسنوی

جین جوہر کی شاعری ''ترانۂ بیداری'' کی روشنی میں

جین جوہر، سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ہیں۔ غلام ہندوستان میں ان کی شاعری کی ابتداء ہوئی۔ شروع میں نظم گوئی سے دلچسپی لی بعد میں غزل گوئی کے میدان میں آئے۔ ان کے اس پہلے مجموعۂ کلام ''ترانۂ بیداری'' میں نظمیں، غزلیں اور رباعیات شامل ہیں۔

انہوں نے شاعری محض شعر کہنے کے شوق مین شروع نہیں کی بلکہ حب الوطنی اور انسان دوستی کے جذبے نے انہیں کہنے پر مجبور کیا۔ وہ غلامی کے کرب کا اظہار اہلِ وطن کے سامنے کرنا چاہتے تھے جس کے لئے انہوں نے شاعری کو ذریعہ بنایا لیکن ساتھ ساتھ اپنے دل میں مچلتے ہوئے نوجوانی کے جذبات کا ایک خاص انداز سے اظہار بھی کیا اور کامیاب رہے۔

ان کی کامیابی کی وجہ ان کے مزاج کی سادگی، صالح جذبات کی ترجمانی، خیالات کی پاکیزگی، فکر کی گہرائی کے ساتھ عام فہم زبان کی روانی ہے۔ عام طور سے انہوں نے اپنے خیالات اور جذبات کو آسان زبان میں پیش کیا ہے جو قاری پر اپنا ایک خاص اثر چھوڑتے ہیں۔

کتاب کا نام اپنی نظم ''ترانۂ بیداری'' کے تعلق سے رکھا ہے جو انہوں نے فرنگیوں کے ہندوستان پر ظلم وستم سے مضطرب ہوکر ۱۳/مئی ۱۹۴۴ء کو کہی تھی۔ اسی لئے اس مجموعہ کی ابتداء ''ترانۂ بیداری'' سے کی ہے جس کے شروع کے دو بند یہ ہیں.....

جاگ اٹھو اے دنیا والو! سب کچھ پاکر کھونے والو!
خلوت کی تاریک فضا میں اشکوں سے منھ دھونے والو!

بی ایس جین جوہرؔ ترانۂ بیداری کے آئینہ میں : سید احمد سحرؔ شاہجہان پوری 100
میرٹھ کا جوہرؔ تابدار : ڈاکٹر رضیہ حامد 106
مذہبی ہم آہنگی کے علم بردار : اختر شاہجہان پوری 112
بی ایس جین جوہرؔ کی شاعرانہ خصوصیات : مولانا سیدؔ قمر شاہجہان پوری 118
ترانۂ بیداری: ایک تاثر : مولانا سید عقیل الغروی 123
بی ایس جین جوہرؔ کی شاعری: ایک جائزہ : متین طارق باغپتی 126
جوہرؔ صاحب.....ایک تاثر : انور زنزہت 133
ایک طلسمِ جہانِ آرزو : فصیح اکمل قادری 140
بی ایس جین جوہرؔ کا 'ترانۂ بیداری'! ایک تجزیہ : ڈاکٹر ثروت خاں 144
'ترانۂ بیداری' جوہرؔ کے بیدار ذہن کا آئینہ : ڈاکٹر مجاہد فرازؔ 148
'ترانۂ بیداری' (اردو ہندی شعری مجموعہ) : اطہر نیرؔ، دربھنگہ 155
جوہرؔ کے مجموعہ 'ترانۂ بیداری' سے متاثر ہو کر : وجندر سنگھ پرواز 158

تبصرے

ایک جین کا بے چین کر دینے والا مجموعہ کلام.... : یوسف ناظم، ممبئی 160
: ڈاکٹر مناظر عاشقؔ ہرگانوی 163
: محمد ایوب واقفؔ 165
: گلزار راجاوید، راولپنڈی 168
: عطیہ سکندر علی، راولپنڈی 172
: یوگیندر بہل تشنہؔ 174
: کوثر صدیقی 175
: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ 177
: سیفی سرونجی 179

تم نے اپنی قدر نہ جانی

دنیا کی بیدار فضا ہے　　چاروں طرف کہرام مچا ہے
لاشوں کے انبار پڑے ہیں　　دولت کا دل کانپ رہا ہے
لیکن تم ہو محوِ غلامی

آگے نہایت جوش کے ساتھ اہلِ وطن کو کہتے ہیں.....

قدرت پر انصاف نہ چھوڑو　　ظلم و ستم کی گردن توڑو
روگ، بڑھاپے کو للکارو　　موت کی ظالم باہیں موڑو
دنیا کُن گائے گی تمہارے

اور نظم کا خاتمہ اس بند پر کرتے ہیں.....

پھولوں سے شادابی لے کر　　جگنو سے بیتابی لے کر
زہرہ کی ننھی شرمیلی　　آنکھوں سے بے خوابی لے کر
راہ میں اپنی بڑھتے جاؤ

اس پہلی ہی نظم سے جوہر صاحب کے وطن سے متعلق جذبات واحساسات اور انداز فکر سے بھرپور آگاہی ہوجاتی ہے۔ اسی اندازِ فکر کی جھلک عام طور سے ان کی کئی نظموں میں محسوس ہوتی ہے۔

دنیا کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ اپنی نظم ''مذہب'' میں کہتے ہیں.....

دنیا میں تشدّد چھایا ہے، تہذیب کی یہ عریانی ہے
یہ دھرتی خون کی پیاسی ہے، قتلِ نوعِ انسانی ہے
کٹتے ہیں جہاں میں جگہ جگہ، انساں گاجر مولی کی طرح
اس دور میں خونِ انساں کی ارزانی سے ارزانی ہے
مذہب کے ترانے کیا چھیڑوں، مذہب کے زمانے بیت گئے

اس نظم کے مطالعے سے اس بات کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ مذہبی تعصب کی وجہ سے

جوفسادات سر اٹھاتے ہیں ان سے بھی ان کے دل میں مایوسی پیدا ہو گئی تھی۔

''محبت کس طرح کرلوں'' میں جوہر اپنے ایک ایسے فیصلے کا علان کرتے ہیں جس سے انسان دوستی کے جذبات واضح طور سے سامنے آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں.....

زمانے کی فضا میں مجھ کو بو بن کے بکھرنا ہے
ازل سے اونگھتی دنیا کو اب بیدار کرنا ہے
خرد کا جال مجھ کو پھینکنا ہے آسمانوں پر
اٹھانا بوجھ دنیا کا ہے سارا اپنے شانوں پر
جہاں سے نام اٹھ جائے گا اک دن بربریّت کا
سبق دینا ہے عالم گیر اخوت اور محبت کا
بتاؤ تو سہی تم سے محبت کس طرح کرلوں

انہوں نے اپنی بعض نظموں میں جنگ کے حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس کے خلاف آواز اس طرح اٹھائی ہے۔ نظم ''فطرت کے پجاری'' کا یہ بند ملاحظہ کریں.....

جنگ و جدل کے شعلے ہر سو، ایک موجِ طوفانی
امن و محبت کے ساگر میں آئی ہے طغیانی
کھیل رہی ہے خاک و خوں سے پھر نسلِ انسانی
اپنے فرض سے غافل ہونا ہے تیری نادانی
اے شاعر، اے حسن کے شیدا، اے فطرت کے پجاری

اور ایسے تباہ کن حالات میں وہ دنیا کے لئے پر امن زندگی کی آرزو کا اظہار اس طرح کرتے ہیں.....

چھیڑ وہ نغمہ جو شعلوں پر برسے بن کر شبنم
پیار محبت کی لے میں ہو سات سروں کی سرگم
ایسا کچھ لکھ جس سے بدلے کہنہ نظم عالم

اور رواداری پر آخر ہو یہ دنیا قائم

اے شاعر، اے حسن کے شیدا، اے فطرت کے پجاری

وہ اپنی نظم ''درسِ آدمیت'' میں جنگ سے متعلق ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں.....

بحرِ تہذیب میں برپا ہے یہ طوفان کا شور
ہے قیامت کی صدا فتنہ گر انسان کا شور
سینۂ تیرہ و تاریک میں ارمان کا شور
توبہ توبہ کہ یہ اس بے سرو سامان کا شور
آدمیت کے اصلوں کا جنازہ ہے یہ جنگ
خون انسان کی ہولی کا تماشا ہے یہ جنگ

اور.....

موت آتی ہے جوانوں کو نگل جاتی ہے
نونہالانِ گلستاں کو کچل جاتی ہے
غل مچاتی ہوئی جس سمت نکل جاتی ہے
وہیں انسان کی بنیاد دہل جاتی ہے
ڈھیر کر دیتی ہے اک آن میں ارمانوں کا
زور چلنے نہیں پاتا ہے کچھ انسانوں کا

اس عالم میں مفلسوں پر کیا گزرتی ہے، اس پر روشنی اس طرح ڈالتے ہیں.....

جنگ کے سائے میں کس طرح سے رہتے ہیں غریب
کچھ فسانے غم و آلام کے کہتے ہیں غریب
کیسے کیسے وہ مصائب ہیں جو سہتے ہیں غریب
ہائے افلاس کے سیلاب میں بہتے ہیں غریب
ان کی حالت تو ذرا دیکھ کہ ہے باعثِ ننگ
سیکڑوں آدمی پھرتے ہیں یہاں ننگ دھڑنگ

اسی کے ساتھ انہوں نے قدرتی مناظر پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ذرا صبح کے منظر سے ان کی نظم ''اوشا'' کے اس بند سے لطف اندوز ہوں.....

چمن میں رنگیں قبا پہن کر سحر کی دیوی ہے جلوہ گستر
حسین کلیوں کی انکھڑیوں میں خوشی کے آنسو چھلک رہے ہیں
نسیمِ فردوس چل رہی ہے، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے
ہوا سے شاخیں لچک رہی ہیں، ادا سے پودے لہک رہے ہیں
صبا نے آ کر کلی کلی کے رخِ حسین سے نقاب اٹھا دی
ہوئی ہیں کلیاں جو پانی پانی، سروں سے پلّو کھسک رہے ہیں

نظم ''حسن اور سرمایہ داری'' میں دیہات کے منظر سے بھی لطف اٹھائیں.....

مسکراتی ہے دیہاتوں میں حقیقی زندگی
ہے جہاں چھایا ہوا اک جذبۂ وارفتگی
وہ نسیمِ صبح، وہ دریا کا اندازِ خرام
ایک ایثار مجسّم اور اک نازِ تمام
وہ رہٹ کی خوشگوار آواز، وہ دہقاں کا راگ
گیت گاتا ہے خوشی کے یا مناظر کا سہاگ

یہ بھی سچائی ہے کہ جہاں ان کی شاعری میں ان کا دل دردمند، وطن سے بے پناہ محبت کرتا نظر آتا ہے، مظلوم انسانیت کے لئے تڑپتا محسوس ہوتا ہے۔ حسن کا پجاری بھی دکھائی دیتا ہے۔ حسن کی جلوہ گری ملاحظہ کریں.....

یہ خمار آلود بیداری، یہ اٹھنا اینڈتے
جیسے جاگے کوئی ناگن اپنی لمبی نیند سے
سبز آنچل کی نمو سے جگمگاتا ہے بدن
پھوٹتی ہے جیسے ہریالی سے سورج کی کرن

گوری گوری نرم بانہوں کی سریلی بانسری
روپ ہے یا مسکراتی ہے کنول کی پنکھڑی
یہ صراحی دار گردن میں ترے سونے کا ہار
مانگ لیتا ہے پناہیں جس سے سینے کا ابھار

اور آگے اپنی نظم ''نجمہ سے'' میں ''اپنے جذبات کا اظہار'' کرتے ہوئے کہتے ہیں.....

یہ تیرے حسن میں سنجیدگی، یہ پاک جمال
یہ تیری سیرتِ اعلیٰ، یہ تیرے نیک خیال
تری جبینِ منوّر پہ چاندنی ہے نثار
تری نگاہوں میں معصومیت کا پاک خمار
مگر یہ میرے لئے ہوگئے پریشان خواب
تڑپ رہا ہے تیرے غم میں بدنصیب شباب
پڑے نہ میرے گلے میں یہ ہار اے نجمہ
اے میری جانِ عزیز

اور اپنی نظم ''آ ؤ تو سہی'' میں اپنے جذبہ سے مغلوب ہوکر ملاقات کی دعوت اسطرح دیتے ہیں.....

بھیگی بھیگی ہوئی آنکھوں میں بسائے ہوئے خواب
اپنے آنچل میں لئے صبح کے پھولوں کا شباب
کپکپاتے ہوئے سردی سے سحر کی بیتاب
نیچی نیچی سی نگاہیں کئے آ ؤ تو سہی
مسکراتی ہوئی آ ؤ تو سہی گنگناتی ہوئی، آ ؤ تو سہی

سچی بات یہ ہے کہ جوہر کی شاعری ان کی زندگی کے سفر کے مختلف حالات سے ہی نہ صرف آگاہ کرتی ہے بلکہ ان کے جذبات، احساسات کی سچی ترجمانی بھی کرتی ہیں۔

جہاں تک ان کی غزلوں کا تعلق ہے وہ بھی غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کی ترجمان ہیں۔ غزلوں کی زبان بھی سادہ اور رواں دواں ہے جن میں محبوب کے جلوے کچھ اس طرح سامنے آتے ہیں.....

ترا حسن کافرانہ، مرا عشق والہانہ — نہ تجھے خبر تھی اپنی، نہ مرا کوئی ٹھکانہ
مجھے دیکھ کر کسی کا سرِ راہ مسکرانا — یہی بات تھی ذرا سی یوں ہی بن گئی فسانہ
حسن کے پرستاں میں اک سے ایک بڑھ کر ہے — کس کو نازنیں کہئے، کس کو دلربا کہئے
میری ہر بات پہ بے بات خفا ہوتے ہو — جانے کیا بات ہے دن رات خفا ہوتے ہو
بات غیروں سے تو ہنس ہنس کے کیا کرتے ہو — ہم سے ہوتے ہی ملاقات خفا ہوتے ہو
عہدِ وفا کسی سے، محبت کسی کے ساتھ — کیوں کھیلتے ہیں آپ مری زندگی کے ساتھ
رلاتا ہے ان میں بھی کیا یہ ساون — مجھے کالی گھٹا تڑپا رہی ہے
ترنّم خیز جمنا کے کنارے — کسی کی یادِ پیہم آ رہی ہے

جوہر کی بعض غزلیں نظم نما مسلسل ہیں جس کا اظہار انہوں نے اپنی ایک غزل میں اس شعر میں کیا ہے.....

یہ غزل ہے کہ نظمِ بے عنوان — طرزِ تحریر کچھ نئی سی ہے

ان کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ غمِ جاناں کے مقابلہ میں غمِ دوراں بہت نمایاں ہے۔

دنیا کے لوگ، ایک دوسرے کے ساتھ غیر انسانی سلوک، جنگ اور اس کے بھیانک نتائج اور مذہب وغیرہ سے متعلق انہوں نے اپنے خیالات نہایت سادگی اور بے باکی کے ساتھ پیش کئے ہیں جن کے مطالعہ سے بار بار محسوس ہوا کہ ''یہ بھی میرے دل میں ہے'' اس لئے کہ میرے تجربات اور احساسات بھی کچھ اس طرح کے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کریں.....

میں چپ رہا جب کہ غاصبوں نے ہزاروں لوگوں پہ ظلم ڈھائے
گناہ میں خود شریک رہ کر گناہگاروں کو ڈھونڈتا ہوں

خدائے برتر تری زمیں پر، یہ قتل و غارت، یہ خون خنجر
جہاں میں انساں کی حفاظت کے ذمہ داروں کو ڈھونڈتا ہوں

کس کو رہنما کہئے، کس کو ناخدا کہئے ڈوب جائے جب کشتی، پھر کسی کو کیا کہئے

جس کے نتیجے میں وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں.....

گھر میں رہتے ہوئے ڈر لگتا ہے اب بیابان ہی گھر لگتا ہے
قتل و غارت ہے گلی کوچوں میں شہر دہشت کا نگر لگتا ہے
غیر تو غیر، ہمیں آج کے دن اپنے ہمسائے سے ڈر لگتا ہے
نعمتیں ساری ہیں دنیا میں میسّر لیکن سر پہ لٹکی ہوئی تلوار نظر آتی ہے

عام لوگوں کا حال کچھ اس طرح کا ہے.....

دشمنوں کے ہم سائے دوست کے یہاں ملے
بات اڑی گلی گلی ایسے رازداں ملے

ہے ایک سے ایک آدمی احسان فراموش کس کس سے گلہ کیجئے، کس کس کی شکایت

جوہر کا کہنا درست ہے.....

اگر آدمی کچھ سمجھدار ہوتا تو دنیا میں بس پیار ہی پیار ہوتا
مصیبت میں کوئی مددگار ہوتا تو جینا بھی اتنا نہ دشوار ہوتا
نہ جنت نصیبی کی دیتے دعائیں کہ رشکِ اِرم اپنا سنسار ہوتا
محبت سکھانے پیمبر نہ آتے ہر اِک شخص دھرتی پہ اوتار ہوتا
مٹاتی نہ گاندھی کو نفرت کی آندھی بھگت سنگھ بھی کیوں سرِ دار ہوتا
نہ ہندو نہ مسلم کا یوں خون بہتا گر انسان مذہب سے بیزار ہوتا

یہ سڑکیں، یہ گلیاں نہ خاموش ہوتیں — نہ سنسان و ویران بازار ہوتا
مٹایا ہے اس دیش کو مذہبوں نے — جو مذہب نہ ہوتا تو گلزار ہوتا
کبھی شہر مردوں کی بستی نہ بنتا — نہ سڑکوں پہ لاشوں کا انبار ہوتا
نہ مسجد نہ مندر پہ تکرار ہوتی — کہ انساں کو انساں سے پیار ہوتا
جسے سب محبت سے مل کر بناتے — کوئی ایک ایسا بھی تہوار ہوتا

ملک کی ایسی غمناک اور المناک حالت کے باوجود ان کا حوصلہ بلند رہا۔ انہوں نے جس کا اظہار اس طرح کیا ہے.....

ہندو و مسلماں دونوں کو مجبور تماشا کرلوں گا
میں دیر و حرم کے پتھر سے ایک جلوہ پیدا کرلوں گا
آزادی کے نغمے گا کر مردوں کو جگاؤں گا اک دن
آواز میں اپنی میں پیدا اعجازِ مسیحا کر لوں گا
تسکین کے پھائے رکھوں گا دکھیاروں پر، بیماروں پر
تلخیٔ جہاں کا غم تو میں دو روز میں اچھا کرلوں گا

بلاشبہ ان کی غزلیں جہاں ان کے عاشقانہ جذبات کی آئینہ داری کرتی ہیں، وطن کے حالات سے بھی باخبر کرتی ہیں۔ ان کے صحت مند جذبات اور وطن سے بے پناہ محبت کا بھی اظہار کرتی ہیں۔ زبان کی سادگی بھی دلوں پر خاص اثر چھوڑتی ہے۔

جہاں تک قطعات کا تعلق ہے، وہ بھی قاری کو وطن اور ہم وطنوں کے لئے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ''زبان'' سے متعلق کہتے ہیں.....

جس میں بچے زبان کھولتے ہیں
جس مین من کی مٹھاس گھولتے ہیں

ہندی اردو کا جھگڑا مٹ جائے
ہم وہ لکھیں جو گھر میں بولتے ہیں

''دہشت گردی'' کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں.....

رہزنوں کا ہے راج سڑکوں پر
لٹتی ہے گھر کی لاج سڑکوں پر
نسلِ انساں ہے حادثوں کی شکار
خون بہتا ہے آج سڑکوں پر

آدمی سے متعلق ''المیہ'' میں اس خیال کا اظہار کیا ہے.....

ناپ ڈالی ہے چپہ چپہ زمیں
چھوڑی گہرائی سمندر کی نہیں
چاند تاروں پہ جال ڈال دیئے
آدمی پھر بھی ہے وہیں کا وہیں

وطن کے رہنماؤں سے متعلق جرآت کے ساتھ ''مذہب'' کے تحت کہتے ہیں.....

مذہب کی ترازو میں وطن بانٹ رہے ہیں
میدانِ سیاست میں لہو چاٹ رہے ہیں
یہ دیش کے نیتا تو ہیں خود اپنے ہی دشمن
جس شاخ پہ بیٹھے ہیں اسے کاٹ رہے ہیں

اور نہایت خلوص کے ساتھ ''دعا'' کرتے ہیں.....

نہ کسی کے من میں گلا رہے نہ ہی کوئی مجھ سے خفا رہے
میں کسی کے کام تو آسکوں یہی میرے لب پہ دعا رہے

کاش ہم سب ہندوستانیوں کی زباں پر ہمیشہ یہی دعا رہے۔

جوہر صاحب اپنے قطعات میں اسی طرح کے اپنے تجربات اور دنیا والوں کے اعمال کی طرف روشنی ڈالتے ہوئے اچھائی کے متلاشی نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور سے یہ کہنا بجا ہے کہ جوہر صاحب کی شاعری، دنیا کو صحت مند اندازِ فکر کی طرف لے جانا چاہتی ہے تا کہ دنیا آباد و خوش حال ہو۔ اہلِ دنیا متحد اور ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

کاش وطن کی آزادی کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ اپنا کلام پیش کر سکتے اور زیادہ سے زیادہ اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لئے اپنی آواز بلند کر سکتے۔

اس خوبصورت اور مفید شعری مجموعہ کی اشاعت پر میں جوہر صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ آئندہ ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ بھی پڑھنے کو ملے گا۔

OO

Prof. Abdul Qavi Dasnavi
2, Prince Colony, Eid Gah Hills,
Bhopal (M. P.)

سعید اختر اعظمی : 182
سہیل انجم : 184
اقبال انصاری : 189
عبدالرحمٰن مظہری : 190
سید امتیاز الدین : 193
زہرا مسحور : 196
فراز عارف : 199
کلدیپ گوہر : 205
عالمی سہارا، دہلی : 208

مراسلے

پروفیسر عتیق اللہ 212
افتخار امام صدیقی 213
مظہر امام 214
محمد ایوب واقف 215
عشرت قادری 216
شباب للت 217
محسن بھوپالی 220
پی پی شریواستوا رند 221
عبدالرحمٰن مظہری 222
سید احمد سحر 223
ندا فاضلی 224

○ پروفیسر صغریٰ مہدی

''ترانۂ بیداری''.....از بی ایس جین جوہر

اردو ہندوستان کی زبان ہے اور ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت بھی۔ اس حقیقت کو برسوں سے نظر انداز کرنے کی کوشش کی جارہی ہے مگر اس کے ثبوت اب بھی برابر مل رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں جوہر صاحب کا شعری مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' پڑھ کر یہی احساس ہوا۔ اردو ان کی خاندانی زبان ہے۔ شاعری کا ملکہ خداداد تھا، اچھے استادوں کی حوصلہ افزائی نے اس پر جلا کی، سیماب اکبرآبادی کی شاگردی نصیب ہوئی۔ جوہر صاحب کا کلام کم عمری سے ہی اخباروں میں شائع ہونے لگا تھا۔ یہ مشاعروں میں جاتے اور واہ واہ لوٹتے۔ ان کے والد صاحب نے ان کو بر وقت تنبیہ کر کے یہ احساس دلایا کہ شاعری اور صرف شاعری سے ہی کام نہیں چلتا بلکہ زندگی اور اچھی زندگی گزارنے کے لئے فکرِ معاش بھی ضروری ہے۔ سعادت مند بیٹے نے باپ کی بات مان لی مگر چکّی کی مشقت کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے رہے۔

جوہر صاحب کی شاعری کا زمانہ ایک طویل عرصہ پر محیط ہے۔ اس میں ہندوستان کے سیاسی اتار چڑھاؤ بھی دیکھے جاسکتے ہیں اور شاعری کے مختلف ''رنگ'' بھی۔ اس میں فیضؔ کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' کی ''گونج'' بھی ہے اور اختر شیرانی کی ''سلمیٰ'' بھی ہیں، جاں نثار اختر کی ''انجم'' بھی، کیفی کی نظم ''شگفتگی کی لطافت کا شاہکار ہو تم'' کا انداز بھی مگر جوہر صاحب کی انفرادیت بھی ہے۔

''ترانۂ بیداری'' میں نظمیں بھی ہیں، غزلیں بھی، دوہے بھی اور قطعات بھی۔ ابتدا

نظموں سے ہوتی ہے۔ یہ نظموں کا موضوع وطنی بھی ہے، سیاسی اور رومانی بھی۔ زیادہ تر نظموں میں فطرت کے حسن کا بیان ہے۔ اس موضوع پر سب سے اچھی نظم ''اوشا'' ہے جو جوشؔ کی نظم ''الہیلی صبح'' کی یاد دلاتی ہے۔ اسی طرح ''وفا کی دیوی'' میں فطرت اور انسانی حسن کا خوبصورت امتزاج ہے۔ اسی طرح دوسری نظمیں بھی ہیں۔.....فطرت کے پجاری، حسن اور سرمایہ داری وغیرہ۔

مجموعی طور پر جوہر صاحب کے یہاں رومانی رنگ نمایاں ہے۔ دوسرے موضوعات پس منظر یا پیش منظر میں آتے ہیں جیسے ''نجمہ سے''، ''تم جاؤ گی صبح سویرے'' یا ''آؤ تو سہی''، ''..... کے خط کے جواب میں''، ''برہا کا گیت''، ''معذرت'' ایسی ہی رومانی نظمیں ہیں جو قاری کے دل پر خاص تاثر چھوڑتی ہیں۔ پھر غزلوں کا حصہ ہے۔ نظموں کے اقتباسات تو پیش نہیں کر سکتی، غزلوں کے وہ اشعار جو مجھے یاد آئے پیش کر رہی ہوں.....

سنا تھا جن پر بیادگارِ غمِ شہیداں لگیں گے میلے
میں راج پتھ پر سجے مزاروں میں ان مزاروں کو ڈھونڈتا ہوں
میں چپ رہا ہوں جب کہ غاصبوں نے ہزاروں لوگوں پہ ظلم ڈھائے
گناہ میں خود شریک رہ کر گناہ گاروں کو ڈھونڈتا ہوں

گھر میں رہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ اب بیابان ہی گھر لگتا ہے
ایک ہنگامۂ دیدار کے بعد پھر وہی غم وہی تنہائی ہے
قتل و غارت ہے گلی کوچوں میں شہر دہشت کا نگر لگتا ہے

تری چاہت نے ایسی روحِ زندہ پھونک دی مجھ میں
کہ میری زندگی شوقِ مجسّم ہوتی جاتی ہے
اس کا بہروپ ہیں سب درد کے مارے ہوئے لوگ
ہم نے اک بت کو ہی بھگوان بنائے رکھا

اور یہ قطعہ ۔

نیا سال

چھوتی ہے ہر دماغ کو امید کی شعاع
ہوتا ہے اور ذہن میں یادوں کا اجتماع
ہر سال کچھ لکیریں سی چہرے پہ چھوڑ کر
جاتے ہوئے ہر ایک کو کہتا ہے الوداع

یہ بات بہت اچھی ہے کہ اردو کے ساتھ دیوناگری میں بھی جوہر صاحب نے اپنا مجموعہ ''ترانۂ بیداری'' شائع کیا ہے۔ اس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگ اس کو پڑھ سکیں گے۔

''ترانۂ بیداری'' ایک اچھا رفیق ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کئی دفعہ آپ کو لگے کہ یہ جو جوہر صاحب نے کہا، آپ کے دل میں بھی ہے۔

OO

Prof. Sughra Mehdi
Abid Villa, Gul Mohar Avenue,
Jamia Nagar, New Delhi-25
Phone : 011-26832465

جوہر شناسی

''میری خاندانی زبان اردو تھی، میرے والد اردو کی اچھی قابلیت رکھتے تھے، شعر و شاعری کا بھی شوق تھا، وہی شاید مجھے ورثہ میں ملی.....''

''میری عمر مشکل سے بارہ سال کی ہوگی، ہلکے پھلکے شعر موزوں ہونے لگے.....''

''کالج میں اردو اور فارسی کے دو مولوی صاحبان تھے جو اردو و فارسی کی اچھی استعداد رکھتے تھے، حسنِ اتفاق سے ایک مولوی صاحب لائبریرین میں تھے، میرے ذوق کی بہت قدر کرتے تھے۔ اردو کا تھوڑا بہت لٹریچر اسی زمانے کا تسلسل تھا اور جوہر صاحب اس کی مثال تھے۔ ان کے مزاج میں ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کا پختہ تصور تھا چنانچہ زمانے کے گرم و سرد تھپیڑے کھانے، علم پر تجارت کو ترجیح دینے اور تقریباً نصف صدی تک ادب و شعر کی دنیا سے دور رہنے کے باوجود ان کی شخصیت کا یہ بنیادی جوہر ضائع نہیں ہوا۔ ان کے ملنے جلنے کا انداز، نشت و برخاست، رکھ رکھاؤ، زبان اور سلیقہ، گفتگو وہی ہے جو اگلوں کا تھا۔ ان پر تصنع کا ملمع نہیں چڑھا..... دراصل جوہر صاحب کی ان ہی خصوصیات نے مجھے ان کی طرف متوجہ کیا اور سوچا.....

''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں.....''

اور یہ سعادت میرے حصّہ میں آئی کہ ان کے پرانے کلام کے کٹے پھٹے مسودوں سے کچھ انتخاب کر کے اور ان کی نظموں، غزلوں اور قطعات کو ترتیب دے کر اپنے مکتبہ سے شائع کرادوں۔

اب وہ دن اور تاریخ تو یاد نہیں لیکن انداز اً دو ڈھائی سال پہلے انہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ میں ان دنوں کینسر کا شکار تھا مگر جین صاحب کے خلوص اور شاعری سے ان کے تعلق خاطر کو دیکھتے ہوئے اپنی مقدور بھر محنت کر کے ''ترانۂ بیداری'' کو مرتب کیا اور مجھے خوشی ہے کہ میری توقعات کے مطابق ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوئی۔ اس وقت ان کی شاعری پر کوئی مضمون لکھنا مقصود نہیں، یہ فریضہ میں پہلے ہی ادا کر چکا ہوں۔ دوسرے مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اردو کے معتبر ادیب و قلم کار ڈاکٹر خالد حسین خاں، صدر شعبۂ اردو میرٹھ کالج، میرٹھ، جوہر صاحب کے فن اور شخصیت پر ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں اور وہ تفصیل سے جوہر صاحب کے فکر و فن اور شخصیت پر اپنے شگفتہ اسلوب میں اظہارِ خیال کریں گے۔ اس وقت تو ان کی باغ و بہار شخصیت، شرافتِ نفس، رنگینیٔ طبع، انسان دوستی، ادب و شعر سے شغف اور ان کی صفات کا ذکر کر رہا ہوں جنہوں نے انہیں ایک اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا انسان بھی بنایا ہے۔

جوہر صاحب بہت آزاد خیال انسان ہیں۔ وہ مذہبِ انسانیت کے تو قائل ہیں ہی ساتھ ہی مذہبِ انسانیت کے تمام اصولوں کا احترام کرتے ہیں اور اس پر کاربند بھی ہیں مگر وہ مروجہ مذہب کے قائل نہیں ہیں، ان کی نظر میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ، جین سب مطمعِ انسان کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ محض شاعرانہ انداز سے نہیں بلکہ اپنی نظم ''مذہب'' میں اپنے مطمعِ نظر کو بیان کرتے ہیں.....

''مذہب کے ترانے کیا چھیڑوں، مذہب کے زمانے بیت گئے''

یعنی وہ ''لامذہب'' انسان نہیں اور انسانیت کو ہی سچا مذہب مانتے ہیں اور یہ ان کا شیوہ نہیں بلکہ پختہ یقین ہے کہ مذہب انسان کی فلاح کا ذریعہ نہیں ہے۔

ان کی یہ نظم ۱۹۴۵ء کی ہے۔ وقت کے ساتھ ان کے عقائد میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ کسی پوجا پاٹ کے قائل ہی نہیں ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کے خیالات سے اتفاق کیا جائے کیوں کہ زندگی اور مذاہب کے بارے میں لوگوں کے اپنے اپنے خیالات ہیں مگر جین صاحب

یکسوئی سے انسانی دوستی کے قائل ہیں اوراگر ہے تو انسانیت ہی ان کا مذہب ہے۔ ان کے قطعات، ان کے بیانِ صادق ہیں.....

مذہب کے ترازو میں وطن بانٹ رہے ہیں
میدانِ سیاست میں لہو چاٹ رہے ہیں
یہ دیش کے نیتا تو ہیں خود اپنے ہی دشمن
جس شاخ پہ بیٹھے ہیں، اسے کاٹ رہے ہیں

اپنی اپنی زندگی جیتے ہیں سب
اپنے اپنے زخمِ دل سیتے ہیں سب
شاعری، پیغمبری، بھگتی کے عشق
جس کی جیسی بھی ہے، مے پیتے ہیں سب

غرض میں نے جوہر صاحب کے بحیثیت انسان کے ہی پہچاننے کی کوشش کی ہے، ان کی شناخت بحیثیت ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ یا جین کرنا غلط زاویئے سے سوچنے کے مترادف ہے۔ وہ دہریہ نہیں ہیں بلکہ ایسے ایسی قوت کے قائل ہیں جسے خالقِ عالم کہا جاتا ہے۔ اپنی بات کی تائید میں ان کا ہی ایک شعر پیش ہے.....

ہندو و مسلماں دونوں کو مجبور تماشا کرلوں گا
میں دیر و حرم کے پتھر سے ایک جلوہ پیدا کرلوں گا

OO

Rifat Sarosh
204, Saba Apartment, D-3, Sector 44,
Noida-201303
Mobile : 09810701915

○ پروفیسر خالد حسین خاں

بی۔ایس۔جین جوہرؔ

اپنے مجموعۂ کلام ''ترانۂ بیداری'' کی روشنی میں

محترم بی ایس جین جوہرؔ صاحب کے نام، کام اور مقام سے نابلد تھا۔ جوہرؔ صاحب کے اس ارمغانِ ادب (ترانۂ بیداری) کی دستیابی اوران کے قلم کی سحر کاری نیز تبصرے کی جلد بازی نے مجھے مجبور کر دیا کہ فی الفور اپنی رائے ان کے کلام کے بنظرِ غائر مطالعے کے بعد پیش کروں۔

بہرِ نوع! اچھی اور داخلی شاعری کی پہچان و پرکھ، اس کی باطنی موسیقی اور ارتعاش کی ایسی سحر کاری ہے جو قاری اور سامع کے وجدان و رجحان کو متحرک ہی نہیں متاثر بھی کرتی ہے۔ نیز وجدان وسرور سے ہم کنار بھی اور دل و دماغ سے نفوذ کرتی ہوئی روح میں جذب بھی ہو جاتی ہے۔ جوہرؔ صاحب کی شاعری کا جوہرِ خاص یہ ہے کہ ان کی تخلیقی اپج اور شعوری ہمک اپنے قارئین کے درِ دل پر دستک دئے بغیر نہیں رہتی۔ جوہرؔ صاحب نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ شاعری کے نخلستان میں گذارا ہے۔ ہر رنگ کا مزہ چکھا ہے، ہر تحریک کا اثر لیا اور ہر مکتبِ فکر کا مطالعہ بھی کیا ہے اور تب جا کر اپنا جادہ، اپنی روش اور اپنا اسلوب وضع کیا ہے۔ گویا ان کا رنگِ شاعری ان کا اپنا اور منفرد ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ مجسم شاعر اور سراپا شاعری بن گئے ہیں۔ جو کچھ جوہرؔ صاحب ہیں وہی ان کی شاعری ہے۔ زندگی و زمانے کے تمام تضادات، حسن و عشق کی باہمی کشاکش نے ان کی شاعری میں باہم آمیز ہو کر، ان کو آج کے شعراء کے لئے ایک نمونہ بنا دیا ہے۔ یہ خوبی، یہ محبوبی اور دل آویزی ہر شاعر کا مقدر نہیں بنتی۔

جوہر صاحب کے کلام کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ قاری کو چونکاتے نہیں، مرعوب نہیں کرتے اور شعری بھول بھلیّوں میں گم نہیں کرتے بلکہ عام فہم، سلیس و نفیس اور دل کش الفظوں کے وسیلے سے اپنے قاری یا سامع کے تخیّل کو بیدار کرتے ہیں اور اس کے وجدان کو لطف و لذّت کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔ ان کے شعروں میں بناوٹ نہیں گھلاوٹ ہے۔ تصنّع نہیں تازگی ہے، ظاہر داری نہیں حقیقت ہے۔ ان سب کے باوصف، ان کے یہاں بے ساختہ پن اور سادگی میں پرکاری کی خوبیاں لائق ذکر ہیں۔

جوہر صاحب کی نظمیں، اپنے احوال و افکار میں عصری کوائف کی غماز ہیں مثلاً ''ترانۂ بیداری'' جوان کا اولین مجموعہ کا سرنامہ بھی ہے، یہ نظم اپنے جلو میں، اپنے عہد کی تمام حشر سامانیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس میں کیف بھی ہے، کیفیت بھی، عصری آگہی بھی ہے اور شعریت بھی۔ آزادی کی تڑپ بھی ہے اور جوش و جذبہ کی ہمک بھی، غلامی کی زنجیروں کی جھنکار بھی ہے اور سرفروشی کی تبلیغ بھی۔ غرض کہ ان کی شاعری کی ابتداء ''ترانۂ بیداری'' نظم سے ہوتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان کی زبان سلامت اور سادگی کا ایسا دل کش سنگم ہے جس سے ہر عالم و عامی، نر و ناری اور ناقد و قاری پوری طرح لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

جوہر کے پیغام اور ان کے کلام سے آپ بھی مستفیض ہوں .....

" ترانۂ بیداری "

جاگ اٹھو اے دنیا والو!
سب کچھ پاکر کھونے والو!
دنیا کی بیدار فضا ہے
چاروں طرف کہرام مچا ہے
لاشوں کے انبار پڑے ہیں
دولت کا دل کانپ رہا ہے

لیکن تم ہو محوِ غلامی
فطرت کا ہر منظر اٹھا
رہزن جاگا، رہبر اٹھا
آزادی کا پرچم لے کر
مزدوروں کا لشکر اٹھا
سرخ پھریرے جھوم رہے ہیں
آؤ اے ارجن کی اولادو
قصرِ وطن کی اے بنیادو
طوفانوں سے لڑنا سیکھو
دولت کی تعمیر گرادو
تم پر ہیں دنیا کی نگاہیں

شاعر کیا ہے؟ اسے کیسا ہونا چاہئے؟ اور اس کے دماغ میں کیسی صفات ضروری ہیں۔ ان سب کا اظہار، جوہر صاحب نے اپنی ایک خوبصورت نظم ''فطرت کے پجاری'' میں کس خوبصورتی سے کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں.....

" فطرت کا پجاری "

اے شاعر، اے حسن کے شیدا، اے فطرت کے پجاری
حسنِ ازل کے جلوؤں کی ہے ہر سو تابش بازی
آنکھ تری ہے محوِ تماشا، دل پر جلوے طاری
راحت کا پیغام ہے تجھ کو پھولوں کی بیداری
اے شاعر، اے حسن کے شیدا، اے فطرت کے پجاری

مذکورہ بند سے جوہر صاحب کے احساس اور اظہار بلکہ تعارف و تصریح کا بخوبی اندازہ

ہوجاتا ہے۔

جوہر صاحب چونکہ بذاتِ خود پاک طینت، خود دار اور اشراف ہیں، اسی لئے وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ہم وطن بھی انسانیت کے شیدائی بنیں۔ انسان اور انسانیت کا درس وہ اس لئے بھی دیتے ہیں کہ وہ آدمی نہیں انسان ہیں۔ جس طرح غالبؔ نے صدیوں پہلے کہا تھا.....

''آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا''

بھلا جوہرؔ جیسا صاحبِ کردار اور صاحبِ انسانیت شاعر، اس سے کس طرح مفر حاصل کرتا؟ انہوں نے ایک مکمل نظم ''درسِ آدمیت'' کے عنوان سے سپردِ قلم کی۔ آپ بھی ان کے خیالات سے محظوظ ہوں.....

اٹھ گئے جام و سبو، اب وہ مزا کچھ نہ رہا
گلشنِ زیست میں اب لطف ہی کیا، کچھ نہ رہا
غربت و پستی و ذلت کے سوا کچھ نہ رہا
ہوگیا جذبۂ بیدار فنا، کچھ نہ رہا
صبح کاشی کی ہوئی ہے شبِ ہجراں سے اداس
ہوگئی شامِ اودھ شامِ غریباں سے اداس
بحرِ تہذیب میں برپا ہے یہ طوفان کا شور
ہے قیامت کی صدا فتنہ گر انسان کا شور
سینۂ تیرہ و تاریک میں ارمان کا شور
توبہ توبہ کہ یہ اس بے سر و سامان کا شور
آدمیت کے اصولوں کا جنازہ ہے یہ جنگ
خونِ انسان کی ہولی کا تماشا ہے یہ جنگ

اس نظم میں جہاں جوہر صاحب نے انسانیت اور اس کے متعلقات کا ذکر کیا ہے وہیں انہوں نے پہلے بند کے آخری شعر میں ''صبحِ کاشی'' اور ''شبِ ہجراں'' نیز ''شامِ اودھ'' اور ''شامِ